غالب اور شاہانِ تیموریہ

خلیق انجم

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دھلی

غالب اور شاہانِ تیموریہ

خلیق انجم

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

GHALIB AUR SHAHAN-E-TEMOORIA

BY :

Dr. KHALIQ ANJUM

ISBN : 81-8172-031-8

پہلی اشاعت	:	۱۹۷۴ء
دوسری اشاعت	:	۲۰۰۹ء
قیمت	:	۲۵۰ / روپے
کمپوزِنگ	:	عارفہ خانم
طباعت	:	اصیلا پرنٹنگ پریس، نئی دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۔۲

www.ghalibinstitute.com-- E-mail: ghalib@vsnl.net

فہرست

☆☆☆

رفیقِ حیات

موہنی انجم

کے نام

پیش لفظ

غالبؔ اور اُن کے عہد سے متعلق تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والوں نے عام طور سے اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ وقت وہ تھا جب مغلیہ خاندان کا چراغ گل ہورہا تھا۔ ملک کا سیاسی وتہذیبی نظام اُس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں سے آگے جانے کے راستے خود اربابِ سلطنت کی نگاہوں کے سامنے عیاں نہیں تھے اور پھر چند سو سال میں ہندستان پر مکمل اقتدار کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو چکا تھا اُسے اپنے قبضہ ٔ قدرت میں لینے کے لئے جو زور آزمائیاں ہو رہی تھیں اُن کی بدولت وہ سب کچھ بھی ہاتھ سے نکلتا جارہا تھا جس پر ان کو کبھی اختیار رہا تھا۔ غالبؔ کا خاندان مغل سلطنت کے دور آخر میں ہندستان آیا تھا اور ان کے آبا واجداد وزوال کے اس دور کے سارے خلفشار میں شامل ہونے کی وجہ سے اس کے سود وزیاں کے حصہ دار بھی تھے۔ غالبؔ کو ورثے میں مغل سلطنت اور اس کے مقربین کا قرب حاصل ہوا تھا۔ خاندانی وجاہت اور اس کے علاوہ پنی ذہانت اور ہنرمندی کی بنا پر اہلِ اقتدار میں ایک حیثیت رکھتے تھے اور آگرے سے دہلی آنے کے بعد قلعۂ معلیٰ میں شاہانِ وقت سے ربط وضبط کا اعزاز بھی تھا۔ چنانچہ لازم تھا کہ قلعہ سے غالبؔ کے اس تعلق کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھا اور سمجھا جاتا۔ اتفاق سے غالب اور قلعۂ معلّی کے تعلق سے اب تک زیادہ تر صرف بہادر شاہ ظفرؔ سے ان کے تعلق پر زور دیا گیا اور جتنے عرصے ظفرؔ تخت نشین رہے اس میں دہلی کی علمی، ادبی اور مجلسی زندگی میں غالب کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کی اہمیت کو دیکھا گیا۔ آج ہم بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ انیسویں صدی کی دہلی کی رونق غالب جیسے لوگوں کے دم سے ہی تھی اور آج بھی ہماری ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ہر باب غالبؔ کے بغیر بے آب ورنگ نظر آئے گا۔ مگر شاہانِ وقت سے غالبؔ کا تعلق کا یہ معاملہ اتنا سادہ اور آسان نہیں جتنا اس مواد سے ظاہر ہوتا ہے جو ابھی تک ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ چنانچہ ضروری تھا کہ اس پورے دور کے نشیب وفراز کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کے اندر غالب کی حیثیت کو دیکھا جاتا۔ اس کی طرف سب

سے پہلے ڈاکٹر خلیق انجم نے توجہ دی اور ۱۹۷۴ء میں غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ غالبیات پر مختلف پہلوؤں سے کام کرتے رہے۔ تنقیدی مضامین بھی لکھیں اور ساتھ ہی ساتھ غالب اور شاہانِ تیمور سے متعلق وہ مواد بھی حاصل کرتے رہے جو پہلے اُن کو حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ اب انہوں نے اس کتاب پر نظر ثانی کی اور نئے مواد کی روشنی میں اس پر اپنی تحقیق کو مکمل کرلیا۔ اس کتاب میں بہت سے اہم سوالات کا جواب مل جائے گا۔ مثال کے طور پر اہل اقتدار میں اپنی اہمیت منوانے کے لیے غالب نے جو کچھ کیا وہ اس میں عرصے تک انہیں کامیابی کیوں نہیں ہوئی۔ اُن جیسے شاعر کے ہوتے ہوئے ذوقؔ کو اُستاد شہ ہونے کا شرف کیوں کیوں اور کیسے ملا؟ بہادر شاہ ظفرؔ سے غالبؔ کے تعلقات کن منزلوں سے گزرے اور بالآخر انہیں کامیابی حاصل ہوئی، وہ کیسے ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کے علاوہ دوسرے شہزادوں اور تخت و تاج کے دعویداروں سے غالبؔ کا ربط کیسا تھا اور اس سے انہیں کیا فائدہ یا نقصان ہوا۔ ان سارے معاملات کے دوران غالب کی شخصیت، مزاج کے کون سے پہلو سامنے آئے۔ اس کی بدولت ان کی جو شاعری ظہور میں آئی وہ کیسی تھی۔ اُن کے علاوہ بھی کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ غالبؔ پر تحقیقی کام کرنے والوں اور اس سے عام دلچسپی رکھنے والوں کو غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ کے اس نئے ایڈیشن میں میں بہت کچھ ملے گا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ اس کتاب کو مسرت کے ساتھ شائع کر رہا ہے۔ ہم ڈاکٹر خلیق انجم کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ایک مدت کی محنت کا رسے اس کتاب پر نظر ثانی کر کے ہمیں عنایت کیا۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

حرفِ آغاز

(۱۹۷۴ء)

اکبر شاہ ثانی، بہادر شاہ ظفؔر، تیموریہ شہزادوں اور خاص طور سے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفؔر کے استاد محمد ابراہیم ذوقؔ سے غالبؔ کے تعلقات اُن کے سوانح کے چند واقعات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی زندگی کا وہ اہم حصہ ہیں جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے اور جس کا ان کے فن پر واضح عکس نظر آتا ہے۔

غالب کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ ادبی معرکوں سے قطع نظر ان کے علم و فضل اور شاعرانہ کمال کا غیر معمولی طور پر اعتراف کیا گیا۔ کسی ہم عصر شاعر کے اتنے شاگرد اور معتقد تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے نہیں تھے جتنے غالب کے تھے۔ پھر بھی انھیں یہ شکایت تھی کہ میں ''یوسف بہ قیمتِ اوّل خریدہ ہوں'' یا ''میں عندلیب گلشنِ نا آفریدہ ہوں۔'' غالبؔ کے ہاں اس بے قدری، بیزاری، مجبوری اور ناکامی کے خیالات کا اظہار محض شاعرانہ تعلّی کے نہیں بلکہ مخصوص حالات کے پس منظر میں حقیقت کے طور پر ہوا ہے جس کی ایک بڑی وجہ لال قلعہ ہے۔ لال قلعہ ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہاں کا ادبی مذاق اور روایات ہی دلّی کے بیشتر شعرا اور اہلِ ذوق کے لیے قابلِ تقلید تھیں۔ اس ادبی ماحول میں غالبؔ کی حیثیت ایک اجنبی کی تھی۔ غالبؔ کو شدت سے یہ احساس تھا کہ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اس لیے استادِ شہ اور درباری شاعر ہونے کا حق انھیں اور صرف انھیں حاصل ہے۔ لیکن بعض واقعات اور قلعے کے ادبی مذاق کی وجہ سے طویل عرصے تک ظفر کے دربار میں غالب کی رسائی نہ ہو سکی۔ اور یہ رسائی ہوئی بھی تو اس وقت جب ''قویٰ مضمحل'' ہو چکے تھے۔ اردو غزل کو پہلی بار معنویت، فکر اور گیرائی دینے والے اس عظیم شاعر کو احساسِ تشنگی و ناکامی کی دولت کا بہت بڑا حصہ اسی قلعے سے ملا تھا۔ غالبؔ کا یہ کرب ''ہوں میں کلامِ نغز، و لے نا شنیدہ ہوں'' اُن کی شخصیت کا بہت اہم پہلو ہے۔ اسی کرب

نے ان کے فن کو زمان و مکاں کی قیود سے اس طرح آزاد کیا ہے کہ ہر دور کا انسان اُس میں اپنی دل کی دھڑکنیں سن سکتا ہے۔

اس مقالے میں ظفرؔ اور ذوقؔ سے غالبؔ کے تعلقات کو تاریخی شواہد کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اُن فارسی اور اردو اشعار کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں غالبؔ نے ظفرؔ کو خطاب کرتے ہوئے اپنا اور ذوقؔ کا موازنہ کرکے ذوقؔ کو خود سے کم تر ثابت کیا ہے اور بادشاہ سے اپنا جائز حق مانگا ہے۔ جواں بخت کے سہرے پر غالبؔ و ذوقؔ کا جو ادبی معرکہ ہوا تھا اس کی بنیاد محض شاعرانہ تعلّی پر نہیں تھی بلکہ اس کا سیاسی پس منظر بھی تھا۔ جس کی تفصیلات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اُن تمام قصیدوں اور اشعار کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جو اکبر شاہ ثانی، ظفرؔ اور شہزادوں کی مدح میں غالبؔ نے کہے تھے۔ خطوطِ غالب، دہلی اردو اخبار، سراج الاخبار اور دوسرے ماخذ سے غالبؔ کی اُن غزلوں کی فہرست بھی مرتب کی گئی ہے جو انھوں نے قلعے کے مشاعروں کے لیے کہیں تھیں۔ غالب کے فن کو سمجھنے کے لیے یہ فہرست بہت اہم چیز ہے۔

غالب نے اردو میں شاعری شروع کی تھی لیکن بہت جلد فارسی میں آگئے اور ساری زندگی اس پر فخر کرتے رہے کہ میرا اصل میدان فارسی ہے، غالب کے اس رویے کے وجوہ بھی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں غالبؔ کے رول اور پھر اُن کی تصنیف ''دستنبو'' کی روشنی میں غالبؔ کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

میں اس مقالے کے لیے اپنے کرم فرما مالک رام صاحب، ڈاکٹر اسلم پرویز اور ڈاکٹر گیان چند جین اور اپنے دوست ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مسودے پر نظر ثانی کرکے مفید مشورے دیے۔ مالک رام صاحب کے حکم اور اُن کی محبت کی وجہ ہی سے یہ مقالہ وجود میں آیا۔

خلیق انجم

حرفِ آغاز

(۲۰۰۹ء)

کسی بھی تحقیقی کام کے لیے کوئی نیا موضوع قائم کر کے اس کا آغاز کرنے کی پہلی اور آخری دشواری ماٰخذ اور مواد کی فراہمی ہوتی ہے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد پھر تو آپ ایک گونہ آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے زیادہ تر اپنی ترجیحات کے ساتھ کام کو آگے بڑھاتے ہوئے چلتے ہیں۔ ادب کے سنجیدہ اسکالروں اور یونی ورسٹیوں میں کام کرنے والے ہونہار ریسرچ اسکالروں، دونوں کو غالب جیسی دیو قامت شخصیت، جس کا مطالعہ غالبیات نام کے ایک ادبی ڈسپلن کی شکل اختیار کر چکا ہے، ہمیشہ ایک تجسس میں مبتلا رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے 'غالب اور شاہانِ تیموریہ' جیسے کام کو بھی اوّل اوّل ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور یہ اثر تادیر قائم رہتا ہے۔ 'غالب اور شاہانِ تیموریہ' کا پہلا اڈیشن جلد ہی ختم ہو گیا اور اس کتاب کے دوسرے اڈیشن کے تقاضے بھی شروع ہو گئے۔ کئی دفعہ کتاب پر نظرِ ثانی کی کوشش کی لیکن کچھ تو اس کام میں دل چسپی پیدا نہیں ہوئی اور کچھ مصروفیات مانع رہیں۔ اس دوران غالبیات کے اُفق پر مختلف قسم کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کا انبار لگنا شروع ہو گیا۔

'غالب اور شاہانِ تیموریہ' کی طباعت سے پہلے میرے ذہن میں 'غالب کی نادر تحریریں' کی شکل میں تمام اردو خطوط مرتب کرنے کا کیڑا کلبلا چکا تھا۔ چناں چہ میں رہینِ ستم ہائے روزگار بھی رہا تو اس معنی میں کہ میں غالب کے کوچے کی بھول بھلیّوں ہی میں بھٹکتا پھرا، جس کا نتیجہ پانچ جلدوں پر مشتمل غالب کے تمام اردو خطوط کی تدوین کی شکل میں برآمد ہوا۔ دلّی اردو اکادمی کے قیام کے بعد دلّی کے ادبی آثار کی بازیافت کا سلسلہ شروع ہوا تو سرسیّد کی 'آثار الصنادید' کی تدوین کے پراجیکٹ سے غافل نہیں رہا۔ دہلی کے آثارِ قدیمہ سے ایسی دل چسپی ہوئی کہ 'دہلی کے آثارِ قدیمہ' اور 'درگاہ شاہِ مرداں' جیسی کتابیں لکھنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر غالب کے ساتھ سفرِ کلکتہ پر نکل گیا۔ 'غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ' کی چہار سو جس طرح پذیرائی ہوئی وہ میرے حاشیۂ

خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ یہاں پہنچ کر میرے ضمیر نے ایک بار پھر مجھے جھنجوڑا۔ 'غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ' کی اشاعت کے بعد اِدھر میرے عزیز دوست پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بھی بہ اِصرار یہ کہا کہ آپ پچھلے تیس پینتیس سالوں میں غالب پر جتنا سر کھپا چکے ہیں، اُس کا تقاضا ہے کہ اب 'غالب اور شاہانِ تیموریہ' کا بھی دوسرا اڈیشن آ ہی جائے۔ جس سے یقیناً غالب کی ادبی شخصیت کے کچھ اور نئے گوشے سامنے آئیں گے۔

اکبرشاہ ثانی، بہادر شاہ ظفرؔ، تیموریہ شہزادوں اور بالخصوص استادِ ظفرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے ساتھ غالبؔ کے تعلقات اُن کے سوانح کے محض چند واقعات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی زندگی کا ایک مستقل باب بھی ہیں۔ ان واقعات کا غالبؔ کی شخصیت، اُن کے ذہنی رویّوں اور اُن کے فن پر واضح عکس نظر آتا ہے۔

غالبؔ کو ان کی زندگی ہی میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ ادبی معرکوں سے قطع نظر جن کا معاملہ ہماری ادبی تاریخ میں 'معارضۂ مظہر و آرزو سے لے کر چکبست و شرر اور پھر فراقؔ و اثرؔ تک پگڑیاں اُچھالنے جیسا رہا ہے۔ غالبؔ کے علم و فضل اور شاعرانہ کمال کا غیر معمولی طور پر اعتراف کیا گیا۔ کسی ہم عصر شاعر کے اتنے شاگرد اور معتقد تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے نہیں تھے جتنے غالب کے تھے۔ پھر بھی انھیں یہ شکایت تھی کہ میں یوسف بہ قیمت اوّل خریدہ ہوں یا میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں۔ غالب کے ہاں اس ناقدری، بیزاری، مجبوری اور ناکامی کے احساس کا اظہار لال قلعے کے ان حالات کے زیرِ اثر تھا جنھوں نے ان کی انا کو بے طرح مجروح کیا تھا۔ لال قلعہ ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہاں کا ادبی مذاق اور روایات ہی دلّی کے شعرا اور اہلِ ذوق کے لیے قابلِ تقلید تھیں، اس لیے وہ سوچتے تھے کہ استادِ شہ ہونے کا حق تو انھیں اور صرف انھیں پہنچتا تھا۔ ایسا نہیں ہوا اور ذوقؔ کے جیتے جی قلعے تک غالبؔ کی رسائی نہ ہو سکی۔ غالبؔ کی شاعری میں 'ستم ہائے روزگار' کا خمیر کچھ ان حالات سے بھی اُٹھا تھا۔

اس مقالے میں ظفرؔ اور ذوقؔ سے غالبؔ کے تعلقات کو تاریخی شواہد کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے اور اُن فارسی اور اردو اشعار کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں غالب نے ظفرؔ کو خطاب کرتے ہوئے اپنا اور ذوقؔ کا موازنہ کر کے ذوقؔ کو خود سے کم تر درجے کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بنیاد پر بادشاہ سے اپنے جائز حق کا مطالبہ کیا ہے۔ جواں بخت کے سہرے پر غالبؔ اور ذوقؔ کا جو ادبی معرکہ ہوا تھا اس کی بنیاد محض معاصرانہ چشمک نہیں تھی بلکہ اس کا ایک سیاسی پس منظر بھی تھا، جس کی تفصیلات پر مفصّل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اُن تمام قصائد اور اشعار کی بھی نشان دہی کردی گئی ہے جو غالبؔ نے اکبر شاہ ثانی، بہادر شاہ ظفرؔ اور تیموری شہزادوں کی مدح میں کہے تھے۔ 'خطوطِ غالبؔ'، 'دہلی اردو اخبار'، 'سراج الاخبار' اور دوسرے ماخذ سے غالبؔ کی اُن تمام اردو اور فارسی غزلوں کی فہرست بھی مرتب کی گئی ہے جو اُنھوں نے قلعے کے مشاعروں کے لیے کہیں تھیں۔ غالبؔ کے فن کو سمجھنے کے لیے یہ فہرست بہت اہم ہے۔

غالبؔ نے شعر گوئی کا آغاز اردو سے کیا تھا لیکن جلد ہی وہ فارسی میں آ گئے اور پھر ساری زندگی اس پر فخر کرتے رہے کہ میرا اصل میدان فارسی ہے۔ غالبؔ کے اس رویّے کی وجوہ بھی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں غالبؔ کے رول اور پھر اُن کی تصنیف 'دستنبو' کی روشنی میں غالبؔ کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں کا بھی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب چونتیس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ میں نے اس دوران میں غالبؔ پر بہت کام کیا۔ اس کے علاوہ بہت سے محققین کی کوششوں سے غالبؔ کی شخصیت اور فن کے بارے میں نئے پہلو سامنے آئے، جن سے میں نے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب میں تین ابواب تو ترمیم اور اضافے کے ساتھ پرانے ہی شامل کیے گئے ہیں۔ بقیہ مذکور تین ابواب کے علاوہ تمام تر از سرِ نو لکھا گیا اور پہلے کے مقابلے میں یہ کتاب خاصی ضخیم ہو گئی ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ اور شہزادوں کے بارے میں غالبؔ نے اردو اور فارسی میں جو قصیدے، غزلیں، قطعے، رباعیاں اور متفرق اشعار کہے ہیں، اُنھیں یکجا کر دیا گیا ہے۔

بہادر شاہ ظفرؔ اور شیعیت کے بارے میں کچھ نئی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غرض یہ ہے کہ میری پوری کوشش رہی ہے کہ یہ کتاب پہلے اڈیشن سے بہتر ثابت ہو۔ یہاں میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میری مطبوعات کی تعداد تریسٹھ چونسٹھ کے قریب ہے اور کوئی کتاب ایسی نہیں ہے، جس پر اسلم پرویز نے نظرِ ثانی کر کے مسودوں کو پہلے سے بہتر نہ بنایا ہو۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

اس کتاب کی کمپوزنگ میرے دفتر کی عارفہ خانم صاحبہ نے کی، جنھیں کمپوزنگ میں بہت مہارت حاصل ہے۔ اختر زماں صاحب نے کتاب کی پروف ریڈنگ میں میری بہت مدد کی۔ انجمن کے لائبریرین شاہد خاں صاحب اور اسسٹنٹ لائبریرین تنویر صدیقی صاحبہ نے کتابیں فراہم کرنے

میں میری بہت مدد کی۔ میں ان دونوں حضرات کا بھی ممنون ہوں، خدا ان سب کو سلامت رکھے۔
(آمین)

'مہر نیم روز' کے ابتدائی دو باب خود، غالبؔ کی زندگی کے حالات سے متعلق ہیں۔ یہ باب ہیں 'خطابِ زمیں بوس'' اور ''سببِ تالیفِ کتاب''۔ چوں کہ ان ابواب میں غالب نے اپنی زندگی کے اہم واقعات بیان کیے ہیں، اس لیے یہ دونوں باب اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

میں نے غالبؔ کے تمام اردو خطوط پانچ جلدوں میں مرتب کیے تھے۔ 'غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ' میں غالبؔ کے اردو خطوط کی ان پانچوں جلدوں سے سب سے زیادہ فائدہ میں نے اُٹھایا ہے۔

خلیق انجم

غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ

غالبؔ کے آباواجداد جب اپنے وطن سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے تو اُن کا تعلق شاہانِ مغلیہ سے قائم ہوگیا اور یہ تعلق غالبؔ کی زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہا۔ دہلی کے ایک ادیب مظہرالحق 'مظہرالعجائب' کے نام سے شاعروں کا ایک تذکرہ لکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے غالبؔ سے اپنے مختصر سوانح لکھنے کی فرمائش کی۔ دو صفحات پر مشتمل یہ سوانح سہ ماہی اردو، ۱۹۲۸ء، ص ۳۲۸) میں شائع ہوئے تھے، جس کا عکس اظہارالحق ملک نے غالبؔ کے خودنوشت حالات کے عنوان سے 'احوالِ غالب' مرتبہ پروفیسر مختارالدین احمد میں نقل کیے تھے۔ اس مختصرترین سوانح عمری میں غالبؔ نے اپنے خاندان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''اسداللہ خاں، غالبؔ تخلص، قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں دہلی آئے۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پھاسو کا پرگنہ، جواب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اس کی جاداد میں مقرر تھا۔''[1]

غالبؔ نے اپنے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک فارسی خط لکھا تھا، جس کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے:

> ''میں ترک نژاد ہوں۔ میرا سلسلہ نسب افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے۔ چوں کہ میرے آباواجداد کا سلجوقیوں سے خونی رشتہ تھا، اُن کے عہد میں سرداری اور سپہ سالاری کے جھنڈے اُٹھاتے تھے۔ جب ان لوگوں کا جاہ ومرتبت ختم ہوگیا تو ان میں سے کچھ لوگوں نے رہزنی اور لوٹ مار کا پیشہ اختیار کرلیا اور کچھ کھیتی باڑی کرنے لگے۔ میرے اجداد توران کے شہر

سمرقند منتقل ہو گئے اور وہیں اُنھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں میرے پردادا (کسی بات پر) اپنے والد سے ناراض ہو گئے اور لاہور چلے آئے۔ یہاں اُنھوں نے معین الملک کی ملازمت کر لی۔ قسمت نے معین الملک کا ساتھ چھوڑ دیا تو غالبؔ کے اجداد دہلی آ گئے اور ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں کے ساتھ ہو گئے۔"[۲] (فارسی سے ترجمہ)

مرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں مختارِ عام کے عہدے پر فائز تھے۔ اس طرح بھی غالبؔ کے خاندان کا بالواسطہ طور پر شاہانِ تیموریہ سے تعلق تھا۔

منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کے نام غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے:

"ناچار اب کتابت جُداگانہ میں لکھتا ہوں تاکہ خلعت کا حال اور میرے اور حالات تم کو معلوم ہو جائیں کہ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ نہ رہا۔"[۳]

مرزا قوقان بیگ خاں، شاہ عالم کو چھوڑ کر مہاراجا جے پور کے ملازم ہو گئے اور غالباً اس ملازمت کے دوران اُن کا انتقال ہو گیا۔ غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں نے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ، حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں اور الور میں راؤ راجا بختاور سنگھ کی ملازمتیں کیں۔ اور بختاور سنگھ ہی کے زمانے میں وہ الور میں کسی لڑائی میں مارے گئے جس کا مطلب ہے کہ غالبؔ کے دادا مرزا قوقان بیگ خاں کا بہت طویل عرصے تک شاہانِ مغلیہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہا۔

غالبؔ نے تین مختلف مقامات پر لکھا ہے کہ اُن کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے تھے اور لاہور میں نواب معین الملک کے ملازم ہوئے۔ غلام رسول مہر نے غالبؔ کے اس بیان کے بارے میں لکھا ہے:

"غالبؔ کا یہ دعویٰ محلِ نظر ہے کہ ان کے دادا شاہِ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے، اس لیے کہ شاہ عالم کی پادشاہی کا زمانہ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے اور نواب معین الملک عرف میر منّو نے جن کے پاس

غالبؔ کے دادا لاہور میں ملازم ہوئے تھے۔ نومبر ۱۷۵۰ (محرم ۱۲۶۸ھ) میں وفات پائی۔ لہٰذا ماننا چاہیے کہ میرزا قوقان بیگ خان محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ یہ بیان غالباً عام خاندانی روایات پر مبنی ہے۔ نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کی تصحیح نہ کر سکے۔''[۱۲]

یہی وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے غالبؔ زندگی بھر موقع بے موقع اپنے نسب پر فخر کرتے رہے۔ وہ کبھی خود کو افراسیابی اور پشنگی کہتے، کبھی سلجوقی اور تورانی اور کبھی ایبک ہونے پر فخر کیا کرتے تھے۔

غالبؔ کبھی اس حقیقت پر فخر کرتے تھے کہ اُن کے آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ اُن کا مشہور شعر ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

ہندوستان کے ہزاروں سال پرانے جاگیرداری نظام میں ایسا بارہا ہوا ہے کہ حکومتیں بدلی ہیں۔ کسی ایک فرد نے اپنی ذہانت، شجاعت اور جوڑتوڑ سے اقتدار حاصل کرنا شروع کیا اور کچھ ہی عرصے میں حکومت کی باگ ڈور اُس کے ہاتھ میں آگئی۔ کچھ عرصے تک حکومت اس کے خاندان میں رہی اور جب حکومت خاندان کے اُن لوگوں کے ہاتھ میں آئی جنھوں نے اقتدار اپنے قوتِ بازو کے بل پر حاصل نہیں کیا تھا بلکہ جنھیں یہ ورثے میں ملا تھا تو وہ دولت اور طاقت کے نشے کو زیادہ دن برداشت نہ کر سکے اور رفتہ رفتہ حکومت کسی اور خاندان میں منتقل ہوگئی۔ پھر کچھ عرصے بعد اُس خاندان کا بھی یہی حشر ہوا۔ غرض صدیوں تک یہ کہانی اسی طرح دہرائی جاتی رہی۔ اس کہانی کے کرداروں میں ہندوستانی نژاد بھی تھے اور وہ حملہ آور بھی جو بہت بڑی طاقت بن کر ہندوستان آئے تھے۔ حکومتوں کی اس تبدیلی کا اثر عام ہندوستانیوں پر بہت کم ہوتا تھا صرف حملوں کے وقت ایک سیلابِ خون آتا اور گزر جاتا اور پھر سب کچھ اسی طرح معمول پر آجاتا۔ حکومت کی تبدیلیوں کا ہندوستان کے تمدّن اور معاشرت پر نمایاں اثر اُس وقت پڑتا جب فاتح قوم مستقل طور پر ہندوستان ہی میں سکونت اختیار کر لیتی۔ اس طرح کے حکمرانوں کے ساتھ جو علم اور جو فکر اور فلسفہ ہندوستان آیا ہے، وہ ہندوستانی فکر میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں تو ضرور کرتا رہا لیکن وہ بنیادی خصوصیت جسے ہم ہندوستانیت کہہ سکتے ہیں، بہرحال برقرار رہی۔۔۔۔ انگریز ابتدا میں ہندوستان میں صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کا خیال غالباً قدرے بعد میں آیا۔ انگریز اپنے ساتھ صنعتی نظام کی برکتیں لے کر آئے تھے، اس لیے اُنھوں نے غیرمحسوس

طریقے پر معاشرت، تہذیب، افکار و نظریات کی سطح پر ہندوستانی زندگی کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں کے ساتھ وہ جدید علوم بھی تھے جو نشاۃ ثانیہ میں مغرب نے حاصل کیے تھے اُنہی علوم پر ترقی یافتہ صنعتی نظام کی بنیاد تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی فکر کے اثرات بھی ہندوستانی ذہن پر بڑھتے گئے۔

غالبؔ نے جب ہوش سنبھالا تو مشرقی اور مغربی فکر یعنی نئی اور پرانی اقدار میں کشمکش اور تصادم شروع ہو چکا تھا۔ کلکتے میں ایسے تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے، جہاں مغربی علوم کے ذریعے مشرقی نظام فکر کی بنیادیں ہلائی جا رہی تھیں اور جدید ایجادات کا مظاہرہ کر کے ہندوستانی ذہن کو حیرت اور احساسِ کمتری میں مبتلا کیا جا رہا تھا۔ سرسید کی مرتبہ 'آئینِ اکبری' پر غالبؔ کی تقریظ مغرب سے متاثر ہونے والے اسی ذہن کی نشان دہی کرتی ہے۔

غالبؔ کے دیکھتے ہی دیکھتے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک زبردست اور طاقت ور برطانوی حکومت کی شکل اختیار کر لی۔ اس نئی حکومت کے سامنے ہندوستانی فکر نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہندوستان کا آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر محض نام کا بادشاہ رہ گیا تھا جو در اصل انگریزوں کا پنشن خوار تھا۔ اہلِ علم طبقہ زندگی کے مثبت فلسفوں اور تصورات کی تازگی اور توانائی سے محروم ہو چکا تھا۔ سماج پر ایک مکمل تعطل اور جمود کا عالم تھا۔ برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے ہندوستان کے باشعور طبقے کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ وقت دور نہیں جب برائے نام مغل حکومت کا چراغ بھی گل ہو جائے گا۔ غالب اپنے ایک شاگرد قاضی عبدالجمیل جنون کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعۂ طرح کو کیا کیجیے گا اور اُس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے، اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے ہی نہ ہو۔ اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو۔''[۵]

یہ گویا اس عہد کے ہر باشعور، حساس اور ذہین لیکن مجبور اور بے بس انسان کے دل کی آواز ہے، گویا صرف غالب کی نہیں بلکہ پورے سماج اور پورے عہد کی آواز ہے۔ غالبؔ ایک طرف مغربی علوم، مغربی فکر اور سائنسی ایجادوں کا کھلے دل سے استقبال کرتے ہیں اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خائف اور افسردہ بھی ہیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اودھ پر قبضہ کیا تو غالبؔ کو دلی صدمہ ہوا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تباہیِ ریاستِ اودھ نے، باآنکہ بیگانۂ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کردیا بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہلِ ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔''[۶]

غالبؔ کی فارسی اور اردو ادب پر گہری نظر تھی۔ اُنھوں نے اپنے عہد کے مروجہ علوم مثلاً مذہب، اخلاقیات، تصوف، منطق، ہئیت اور طِب کا باقاعدہ نہ سہی لیکن تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کیا تھا۔ اگر وہ تمام مشرقی علوم پر پوری قدرت حاصل کر لیتے، تب بھی نئے حالات کا صحیح اور مکمل تجزیہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتے، کیوں کہ نئے صنعتی نظام اور اس کے سہارے بڑھتے ہوئے برطانوی سامراج کے اقتدار اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھنے کے لیے یہ علوم کافی نہیں تھے۔ غالبؔ مشرقی تہذیب کے مدّاح اور اس کے زوال کے ماتم گزار ہیں۔ چوں کہ تازہ ہوا کے لیے اُنھوں نے اپنے ذہنی دریچوں کو کھلا رکھا ہے، اس لیے وہ مشرقی اقدار پر تنقید بھی کرتے ہیں اور نئے نظام کا استقبال بھی۔ غالب اس راز سے واقف تھے کہ مغل شہنشاہیت کی تلواریں زنگ آلود اور اس کے دست و بازو شل ہو چکے ہیں اور اب کوئی طاقت اس عظمتِ پارینہ کو واپس نہیں لا سکتی۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ زوال کی آخری حدود کو چھونے والی مغل حکومت یا چھوٹی چھوٹی خودمختار صوبائی حکومتیں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روک نہیں سکتیں۔ غالب انحطاط پذیر طاقتوں سے مایوس ہو چکے تھے، اس لیے کبھی کبھی وہ اس نئے نظام سے اپنی امیدیں وابستہ کر لیتے اور اسی لیے اُن کی وفاداری بھی منقسم تھی۔ وہ ایک طرف تو بادشاہ سے قربت حاصل کرنے کے لیے تمام ذرائع استعمال کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف قصیدے لکھ لکھ کر انگریز افسروں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب سے قبل غالبؔ نے کوشش کی تھی کہ ملکۂ معظمہ سے براہِ راست رابطہ قائم کریں۔ اُنھوں نے ۹ر نومبر ۱۸۵۵ء کو ایک قصیدہ لارڈ ایلن برا کو بھیجا تھا تاکہ ملکۂ معظمہ کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ قصیدے کے ساتھ غالبؔ نے درخواست کی تھی کہ انھیں ملکہ کی طرف سے خطاب عطا ہو اور اُن کے موجودہ خلعت اور پنشن میں اضافہ کیا جائے۔ ابھی خط و کتابت جاری تھی کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہو گیا۔ جب تک ہندوستان کا پلّہ بھاری رہا، غالب قلعے جاتے رہے اور جب ہندوستانیوں کو شکست ہو گئی تو غالبؔ انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔

غالبؔ نے 'دستنبو' میں انقلابیوں کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اس وقت ہر شخص اپنی جان اور آبرو بچانے کی فکر میں تھا۔ غالبؔ نے بھی وہی کیا، لیکن انقلاب کے بعد غالبؔ تقریباً بارہ برس اور زندہ رہے اور ان بارہ برسوں میں اُنھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کو بہت

بڑی تعداد میں خطوط لکھے، لیکن کسی بھی خط میں مغل حکومت کے زوال پر اظہارِ افسوس نہیں کیا۔ مغل حکومت کے آخری تاجدار اور غالب کے مربی اور محسن بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا تو غالب نے مجروح کو لکھا:

"۷ رنومبر ۱۴ جمادی الاوّل سالِ حال، جمعے کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ وقیدِ جسم سے رِہا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ."[۷]

غالب کا یہ بیان کسی بھی جذبے اور احساس سے عاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کو مغل حکومت کے خاتمے اور بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کا کچھ زیادہ غم نہیں تھا۔ انھیں بہ قول اُن کے غم یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں "جان و مال و ناموس و مکان و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لُٹ گئے۔" غالب کو دراصل دلّی، اہلِ دلّی اور خود اپنی تباہی کا غم تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب قلزمِ خوں سے کم نہیں تھا اور غالب اس کے شناور رہے تھے۔ اب غالب کی زبانی اس قلزمِ خوں کی داستان سنیے:

"میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے، اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے، غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت، غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اُس کا بیٹا احمد مرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اُس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں اُن کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا، حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ اُن کو کہاں سے لاؤں، غمِ فراقِ حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا اُن کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے گھر اُن کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجّاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے، ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ

کر کے کہتا ہوں کہ اُن اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔"[8]

عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کے قتل نے غالبؔ کے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا تھا کہ اگر وہ غیر معمولی قوتِ ارادی کے انسان نہ ہوتے تو پاگل ہو گئے ہوتے۔ انھیں اپنی بربادی کا غم تو تھا ہی لیکن دوستوں اور عزیزوں کے قتل اور تباہی نے بھی اُن کے دل و دماغ کو متاثر کیا تھا۔ مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے نام ایک خط میں غالبؔ لکھتے ہیں:

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دُکھ مجھ کو ہے، اُس کا بیان تو معلوم۔ مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو اِن روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اُس میں کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو، ہائے! اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ."[9]

انگریز فاتح دلّی کی عظیم الشان عمارتیں ڈھا رہے تھے۔ یہ کدال پھاوڑے عمارتوں پر نہیں غالبؔ کے دل و دماغ پر چل رہے تھے۔ ان عمارتوں کے ڈھائے جانے پر غالبؔ تڑپ رہے تھے، لیکن محض تماشائی بنے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ تک کی حالت غالبؔ کی زبانی سنیے:

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکاں ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا، اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے

کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اَٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو، اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر، شہر صحرا ہوگیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہوگیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ، اللہ! دلّی نہ رہی اور دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔"[10]

ذرا جامع مسجد کا حال ملاحظہ ہو:

"جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ "دارالبقا" فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈہے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا اچل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔"[11]

اگرچہ اس خط میں غالبؔ نے محض واقعات بیان کیے ہیں، لیکن "رہے نام اللہ کا" اور "باقی سب خیر و عافیت ہے" لکھ کر غالبؔ نے اپنے ذہنی کرب کا بھی اظہار کر دیا ہے۔

ایک اور خط میں غالبؔ نے دلّی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی بربادی کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے کہ وہ خط نثری مرثیہ بن گیا ہے۔ مختصر سے خط میں غالبؔ نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"او میاں سید زادۂ آزادہ، دلّی کے عاشق دل دادہ، ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہرو آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں، ذوقؔ کہاں، مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالبؔ، وہ بے خود، مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلّی! وائے دلّی! بھاڑ میں جائے دلّی۔"[12]

حواشی

غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ

۱- احوالِ غالبؔ: ۳۲

۲- اوراقِ معانی: ۸۰

۳- غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۵۳۳

۴- غالبؔ کے خطوط، غلام رسول مہرؔ

۵- غالبؔ کے خطوط: ۴: ۱۴۹

۶- غالبؔ کے خطوط: دیباچہ

۷- غالبؔ کے خطوط: ۲: ۵۳۹

۸- غالبؔ کے خطوط: ۲: ۷۷۵۔۷۷۶

۹- غالبؔ کے خطوط: ۱: ۲۸۱

۱۰- غالبؔ کے خطوط: ۲: ۵۱۳

۱۱- غالبؔ کے خطوط: ۲: ۵۱۳

۱۲- غالبؔ کے خطوط: ۳: ۵۲۵

ذوقؔ اور غالبؔ

ذوقؔ عمر میں غالبؔ سے تقریباً آٹھ سال بڑے تھے۔[1] جب غالبؔ نے ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۲-۱۸۱۳) میں دلّی میں مستقل سکونت اختیار کی تو ان کی عمر لگ بھگ پندرہ سال تھی۔[2] دلّی آنے سے چار پانچ سال پہلے سے وہ شعر کہہ رہے تھے[3] گویا جب وہ دلّی پہنچے ہیں تو اِن کا ادبی شعور خاصا پختہ تھا۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ، میر قمر الدین منّتؔ، مرزا عظیم بیگ عظیمؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، حکیم قدرت اللہ قاسمؔ وغیرہ اکبر شاہ ثانی کی بزمِ سخن کی رونق تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو شعر وسخن سے اپنے والد سے کہیں زیادہ دل چسپی تھی۔ وہ نہ صرف شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ خود بھی شاعر تھے۔ ۱۲۲۴ھ[4] میں اُن کا دیوان شائع ہو چکا تھا۔ انھیں شاہ نصیرؔ، عزت اللہ عشقؔ اور میر کاظم حسین بے قرارؔ سے تلمذ رہ چکا تھا۔ غالباً ۱۲۲۳ھ کے لگ بھگ ذوقؔ کی رسائی بہادر شاہ ظفرؔ تک ہوئی۔

بہر حال، یہ یقینی ہے کہ ذوقؔ ۱۲۲۵ھ سے قبل قلعۂ معلّیٰ سے وابستہ ہو چکے تھے۔ کیوں کہ شہزادہ جہانگیر کی شادی پر اُنھوں نے قصیدۂ تہنیت پیش کیا تھا جس میں یہ شعر بھی شامل تھا:

کہو سرِ لب بستہ سے شادیِ فرزند
مبارک آپ کو ہو، اے شہِ سپہر وقار!

۱۱۹۳+۳۲=۱۲۲۵ھ

گویا غالبؔ کے دلّی آنے سے قبل ہی ذوقؔ کو بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہو چکا تھا یا کم از کم وہ بہادر شاہ ظفرؔ کے مقرّبوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ غالبؔ جیسے کم عمر لڑکے کی اکبر شاہ ثانی کے دربار میں رسائی آسان نہیں تھی۔ وہاں بڑے بڑے اساتذۂ فن موجود تھے، اس

لیے غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے ہاں باریاب ہونے کی جدو جہد کی ہوگی۔ بہادر شاہ ظفرؔ پر ذوقؔ کا اثر تھا ہی، غالبؔ کی مخصوص افتادِ طبع اور مزاجِ شعری دونوں ان کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوں گے۔ ابتدا میں کلامِ غالبؔ شہر اور قلعہ دونوں جگہ بہت زیادہ مقبول نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک سیاسی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ غالبؔ کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے ۱۸۰۳ء میں آگرے کا قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا تھا۔ انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد ان کے وارثوں میں جن لوگوں کو پنشن ملتی تھی، اُن میں غالبؔ بھی تھے۔ انھیں مغل حکومت نے نہیں، مرہٹوں نے صوبہ دار مقرر کیا تھا لیکن ایک ضعیف اِمکان اس کا بھی ہے کہ قلعے میں اس بنیاد پر بھی غالبؔ کی مخالفت ہوئی ہو۔ بہر حال وجہ کچھ بھی رہی ہو، حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں غالبؔ کی رسائی نہیں ہوئی۔ غالبؔ اپنے آپ کو ذوقؔ کے مقابلے میں بڑا شاعر سمجھتے تھے اور یہ حقیقت بھی ہے۔ مگر غالبؔ کی شاعری اپنے عہد سے زیادہ، آنے والے عہد کی شاعری تھی۔ غالبؔ کا خیال بالکل درست تھا:

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

اردو میں یہ روایت تو رہی ہے کہ کسی شاعر نے ابتدا فارسی سے کی، لیکن بعد کو اردو میں شعر کہنے لگا۔ لیکن غالبؔ اور اقبالؔ کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسی مثال ملے کہ اردو میں شعر کہنے والا فارسی میں چلا گیا ہو۔ (اگرچہ غالبؔ کے ابتدائی عہد کی ایک فارسی غزل کا سراغ بھی ملتا ہے۔ لیکن آغاز میں ان کی بیشتر توجہ اردو ہی کی طرف تھی) اقبالؔ نے فارسی گوئی اس لیے اختیار کی تھی کہ وہ سیاسی افکار کے لیے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے کو مخاطب بنانا چاہتے تھے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ غالبؔ فارسی زبان کے مزاج شناس تھے۔ انھیں فارسی پر پوری قدرت حاصل تھی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس تبدیلی کی وجہ اس عہد میں غالبؔ کی نامقبولیت اور خاص طور سے قلعۂ معلیٰ میں ذوقؔ کی عزّت افزائی تھی۔

قصائدِ ذوقؔ مرتبہ سر شاہ سلیمان میں دس ایسے قصیدے شامل ہیں جو ذوقؔ نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں کہے تھے۔ یہ سب قصیدے اردو میں ہیں۔ اس کے برعکس غالبؔ نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا، وہ فارسی میں ہے۔ عین ممکن ہے کہ غالب بتانا چاہتے ہوں کہ ان کا اصلی میدان فارسی ہے نہ کہ اردو۔ اس لیے انھیں اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل ہے۔

ذوقؔ کو خاقانیِ ہند کا خطاب اکبر شاہ ثانی نے دیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ذوقؔ نے جو قصیدے شاہزادہ سلیم کی شادی کے موقع پر لکھ کر اکبر شاہ ثانی کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس میں یہ شعر بھی تھا:

مدحِ حاضر کے لیے حاضرِ دربار ہو ذوقؔ

تو ہے خاقانیِ ہند، اور وہ ہے خاقانِ زماں [5]

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہنا تو بہت مشکل ہے۔ لیکن اِمکانِ قوی یہ ہے کہ شاعری کے ابتدائی زمانے میں غالبؔ کو اردو سے برگشتہ کرنے میں اس خطاب کو بھی اچھا خاصا دخل تھا۔ کچھ عرصے بعد غالب اس پر فخر کرنے لگے کہ ان کا اصل میدان فارسی ہے۔ اُنھوں نے ایک فارسی قطعے میں اپنی فارسی گوئی پر فخر کرتے ہوئے ذوقؔ پر چوٹ کی ہے۔[6] اشعار کے اس قطعے کے ابتدائی تین اشعار ہیں:

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتۂ

کے بہ پُر گوی فلاں در شعر ہمسنگِ منست

راست گفتی، لیک می دانی کہ نبود جاے طعن

کمتر از بانگِ دہل گر نغمۂ چنگِ منست

فارسی بیں، تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ منست

غالبؔ کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایک عظیم فن کار ہیں لیکن اس پایے کے فن کار کا جو رویّہ زندگی کی طرف ہونا چاہیے، غالب اس سے محروم ہیں۔ عام طور پر عظیم فن کار ''شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا'' کی مجسّم تفسیر ہوتا ہے۔ وہ فن کو خونِ جگر سے سینچتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے اسے تمام مادّی ضرورتوں اور آسایشوں سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔ غالب کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کا آدرش عظیم فن کی تخلیق ہے، لیکن دوسری طرف ذوقؔ کا سماجی وقار بھی اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ غالب بخوبی واقف تھے کہ ان کا فن ذوقؔ اور ظفرؔ دونوں کے فہم وادراک سے بلند تر ہے لیکن بادشاہ سے قربت حاصل کرنے کی تمنّا نے انھیں زندگی بھر انگاروں پر لوٹایا۔ اس قطعے میں غالبؔ اپنی شاعری کو نغمۂ چنگ اور ذوقؔ کے فن کو بانگِ دہل کے مماثل کہتے ہیں۔ وہ اس پر ناز کرتے ہیں کہ اُن کا اصلی میدان اردو نہیں، فارسی ہے۔ بلکہ وہ اپنی اردو شاعری کو آئینے پر لگے ہوئے زنگ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ غالبؔ کہتے ہیں، جس اردو شاعری پر تم کو ناز ہے، وہ میرے لیے تو باعثِ شرم ہے۔ اسی ضمن میں وہ بہادر شاہ کی مدح کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ میں

انوریؔ، عرفیؔ اور خاقانیؔ ہوں۔ گویا اکبر شاہ ثانی کے دربار سے ذوقؔ کو جو خاقانیِ ہند کا خطاب ملا تھا، غالبؔ کے خیال سے اس کے اصلی حق دار ذوقؔ نہیں، غالبؔ تھے۔ اس قطعے سے ایک اور اہم بات کا پتا چلتا ہے کہ ذوقؔ نے غالبؔ کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے تھے۔ ممکن ہے اُنھوں نے دوسرے موقعوں پر بھی یہ کیا ہو۔ اسی لیے غالبؔ کو کہنا پڑا کہ بادشاہ جانتے ہیں کہ میں اُن کا مدّاح ہوں، اگر تم اسے میرے فریب پر محمول کرو تو کیا ہوتا ہے۔ اسی قطعے میں غالب نے وہ بات بھی کہہ دی، جس نے زندگی بھر انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ ذوقؔ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمھارا کوئی قصور نہیں، قصور تو میرے دلِ تنگ کا ہے جو مجھ پر ظلم ڈھاتا ہے۔ کیا کروں میری قسمت ناسازگار ہے اور خوے دوست (یعنی بہادر شاہ ظفرؔ) اور بھی زیادہ ناسازگار......اس قطعے میں غالبؔ کی شخصیت کا پورا تضاد اُبھر کر سامنے آ گیا ہے۔ تماشاے اہلِ کرم دیکھنے کے لیے انھیں طرح طرح کے بھیس بدلنے پڑے۔ ان کے بہت سے ارمان پورے ہوئے لیکن سیری نہ ہو سکی۔ غالبؔ اکثر ذوقؔ دشمنی میں یہ بھول جاتے تھے کہ ذوقؔ کو استادِ شہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی اردو شاعری کا مذاق اُڑانے کا مطلب ظفرؔ کی شاعری کا مذاق اُڑانا ہے۔ انھیں جاہل بتانا خود بادشاہ کو جاہل ثابت کرنے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے کہ غالبؔ کے اس قسم کے اشعار سے ظفرؔ اور بھی کبیدہ خاطر ہوتے ہوں گے۔

غالبؔ کو جب بھی کوئی موقع ہاتھ آیا، اُنھوں نے ذوقؔ کو کمتر ثابت کرنے میں کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ایک طویل قصیدے کے چند اشعار میں کسی شاعر سے اپنا مقابلہ ان الفاظ میں کیا ہے:

بالد بخویش خواجہ، چو گوئی سخنورش
غافل کہ ایں ترانہ، بہ بہتاں برابر است

نے ہر ترانہ سنج، نکیسا نوا بود
نے ہر سخن سرای، بہ سحباں برابر است

نے ہر شتر سوار، بہ صالح بود ہمال
نے ہر شبان، بموسیِ عمراں برابر است

نے ہر کہ گنج یافت، ز پرویز گوی بُرد
نے ہر کہ باغ ساخت، برضواں برابر است

گفتی کہ این و آن بود از نطق مایہ در

این در شمارِ شیوہ نہ با آں برابر است

گیرم کہ ہرگیاہ برد از ابر و باد فیض

خر زہرہ کے بسنبل و ریحاں برابر است

امروز من نظامی و خاقانیم بدہر

دہلی زمن بہ گنجہ و شرواں برابر است

ان اشعار میں غالبؔ نے کہیں ذوقؔ کا نام نہیں لیا، لیکن ظفرؔ کو مخاطب کر کے اگر غالبؔ کسی اور سخن ور سے اپنا مقابلہ کریں تو وہ ذوق کے سوائے اور کون ہوسکتا ہے؟ غالبؔ کہتے ہیں، جب لوگ خواجہ (ذوقؔ) سے اس کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور نہیں جانتا کہ اس کی یہ تعریف نہیں بلکہ اس پر بہتان باندھا جارہا ہے۔

ان اشعار میں بھی غالبؔ نے طرح طرح کی تشبیہوں کے پردے میں چھ شعروں میں صرف اتنی بات کہی ہے کہ فن میں ذوقؔ کا مرتبہ مجھ سے کم ہے۔ آخر میں پھر وہی بات دہرائی ہے جو وہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ذوقؔ اگر خاقانیِ ہند ہیں، تو کیا، میں خاقانیِ دہر ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان اشعار کا اثر ذوقؔ کے شاگرد ظفرؔ پر اچھا نہیں ہوا ہوگا۔

غالبؔ اور ذوقؔ میں سہرے کے معرکے کے سوائے براہِ راست کبھی کوئی چپقلش نہیں ہوئی۔ البتہ دونوں غزل کی رمزیت کا سہارا لے کر ایک دوسرے پر چوٹیں ضرور کرتے رہے۔ مثلاً ذوقؔ کی پوری شاعری میرؔ کی داخلیت کی نفی کرتی ہے۔ اس پس منظر میں غالبؔ کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

غالبؔ، اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ

''آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں''

ظاہر ہے غالبؔ نے ناسخؔ کے مصرع کو بے وجہ تضمین نہیں کیا۔ اس شعر میں ذوقؔ پر چوٹ کی گئی ہے۔ ذوقؔ جواب دیتے ہیں:

نہ ہوا پر نہ ہوا، میرؔ کا انداز نصیب

ذوقؔ! یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اب غالبؔ کی ایک مشہور غزل کے بارے میں چند گزارشات ملاحظہ ہوں:

غالبؔ ۴؍جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندانِ مغلیہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے۔ اس سے کچھ دن بعد اُنھوں نے ایک غزل کہی، جس کے کچھ اشعار یہ بھی ہیں:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ 'تو کیا ہے؟'
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

نہ شعلے میں یہ کرِشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خو کیا ہے؟

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

ان چھ اشعار میں غالبؔ نے ظفرؔ اور ذوقؔ سے اپنے تعلقات کی پوری داستان بیان کی ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ غزل 'دیوانِ غالب' کے پہلے اڈیشن (۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء) میں شامل نہیں۔ اور پھر غالب کے لیے اس مفہوم کا مقطع اس وقت تک کہنا ممکن نہیں تھا جب تک اُنھیں خود ظفرؔ سے قربت حاصل نہ ہوئی ہوتی۔ کیوں کہ بادشاہ کے استاد پر اتنی کھلی چوٹ غالبؔ کے لیے ممکن نہیں تھی۔ پھر اپریل ۱۸۵۲ء میں سہرے والا واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس کے بعد تو ایسی غزل کہنا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میرا قیاس ہے کہ یہ غزل جولائی ۱۸۵۰ء (جب غالب قلعے میں ملازم ہوئے) اور اپریل ۱۸۵۲ء (سہرے کی تاریخ) کے

درمیانی زمانے میں لکھی گئی۔ غزل کے مطلع سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب، ظفر کے رویئے کی شکایت کررہے ہیں۔ دوسرے شعر میں ظفر کی زودرنج طبیعت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ غالب اور ظفر کے تعلقات کے سلسلے میں بیان کیا جاچکا ہے۔ ظفر عہدِ شاہزادگی ہی سے ناراض تھے۔ تیسرے شعر میں ذوق اور ظفر کے تعلقات پر بڑی چابک دستی سے چوٹ کی گئی ہے۔ چوتھے شعر میں غالب نے کلامِ ذوق پر جن مختصر الفاظ میں تنقید کی ہے، شاید اس سے بہتر تنقید ممکن نہیں۔ پانچویں شعر میں غالب نے اپنی مجبوری اور بے بسی کا ذکر کیا ہے اور مقطعے میں تو ذوق پر کھلی چوٹ ہے ہی۔ غالب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر وہ مقطعے میں اپنے کسی ممدوح کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی تو پوری غزل اور کبھی چند اشعار میں غزل کے رمزی اِمکانات سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ممدوح سے خطاب کرتے ہیں۔ اس غزل میں غالب نے جو کچھ کہا ہے، ممکن نہیں کہ ظفر نے اسے محسوس نہ کرلیا ہو۔ اس کا ثبوت وہ مشہور معرکہ ہے، جو سہرے کے سلسلے میں ہوا۔

حواشی

ذوق اور غالب

محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق کی تاریخ ولادت ۱۱رذی الحجہ ۱۲۰۴ھ اور 'آبِ حیات' میں صرف ۱۲۰۴ھ لکھی ہے (دیوانِ ذوق: ۲۔ آب حیات: ۵۲۰) ذوق کی وفات کی اطلاع دیتے ہوئے سلطان الاخبار (کلکتہ) نے ان کا سنہ ولادت بھی دیا ہے۔ اخبار مذکور لکھتا ہے۔ ''ولادتِ شیخ در یک ہزار و دو صد و سہ سال ہجری واقع گشت۔'' بحوالۂ عابد رضا بیدار، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۴۵

غالب کی تاریخِ ولادت ۸ر رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء) ہے۔ (ذکرِ غالب: ۲۳)

۲۔ ذکرِ غالب: ۴۵

۳۔ کلیاتِ فارسی کے آخر میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظ شامل ہے۔ جس میں غالب لکھتے ہیں: ''از روزی کہ شمارۂ سنینِ عمر از احاد فرا ترک رفت ورشتۂ حساب زحمتِ یازدہمیں گرہ بخود برگرفت۔ اندیشہ در روار دگام فراخ برداشت دگریوہ و مغاکِ بادیۂ سخن پیمودن آغاز نہاد۔'' (کلیات: ۵۵۳۔۵۵۴)

۴۔ ظفر کا یہ دیوان اوّل مطبعِ سلطانی، قلعۂ معلیٰ میں چھپا تھا۔ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہے۔

۵۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ 'گلشنِ بے خار' میں اس خطاب کا ذکر ہے اور 'گلشنِ بے خار' اکبر شاہ ثانی کی زندگی میں (۱۸۳۵ء) لکھا گیا تھا۔

۶۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس قطعے کے بارے میں لکھا ہے کہ ''قیاس ہے کہ اس میں ذوق سے خطاب ہے۔ یہ بہت قرینِ قیاس ہے۔ لیکن کوئی روایت جو اس کی مصدق ہو، اب تک نہیں ملی (بین الاقوامی غالب سمینار، مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ص ص ۴۹۔۵۰) 'آبِ حیات' میں بھی یہی ہے۔

جواں بخت کا سہرا

زینت محل کے صاحب زادے جواں بخت کی منگنی مئی ۱۸۵۱ء میں ہوئی اور برات وودایع عروس اپریل ۱۸۵۲ء میں عمل میں آئی۔

غالبؔ نے زینت محل کے ایما پر اس تقریب پر اپنا مشہور سہرا کہا، جس کا مقطع ہے:

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرف دار نہیں
دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

اس قطعے میں بظاہر محض شاعرانہ تعلّی ہے، جو اکثر شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔ اس حیثیت سے اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی لیکن ظفرؔ اور ان کے مقربوں کے ذہن میں غالبؔ کے یہ اشعار بھی تھے جو وقتاً فوقتاً کہتے رہے تھے:

راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخرِ تست، آں ننگِ من است
گیرم کہ ہر گیاہ برد از ابر و باد فیض
خر زہرہ کے بہ سُنبل و ریحاں برابر است
امروز من نظامی و خاقانیم بدہر
دہلی زمن بہ گنجہ و شرواں برابر است

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے؟

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے، ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟[۲]

ظاہر ہے کہ ان تمام اشعار میں کسی شاعر پر چوٹ کی گئی ہے اور وہ ذوقؔ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ آخری دو شعروں کا واقعہ تو ابھی تازہ ہی تھا، اس لیے ظفرؔ بھڑک گئے۔ اُنھوں نے ذوقؔ سے اس شاعرانہ تعلّی کا جواب دینے کی فرمائش کی۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ غالبؔ نے یہ سہرا نواب زینت محل کی فرمائش پر لکھا تھا۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی گئی ہے۔ نواب زینت محل کا الگ گھر بنواکر قلعے سے دور رہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ قلعے میں زینت محل کے دشمنوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ وجہ ظاہر ہے! بہادر شاہ ظفر زینت محل سے بہت محبت کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ زینت محل اپنے اکلوتے بیٹے جواں بخت کو ولی عہد بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ حکیم احسن اللہ خان کے زینت محل سے بہت اچھے تعلقات تھے اور غالبؔ حکیم صاحب کے بہت بڑے مدّاح تھے جس کی تصدیق غالبؔ کی متعدد تحریروں سے ہوتی ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر یا تو غالبؔ قلعے کی سیاست میں عملی طور پر حصّہ لے رہے تھے یا کم از کم ان کے بارے میں عام خیال یہی تھا۔ اس سہرے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قلعے میں استاد ذوقؔ کے ہوتے ہوئے زینت محل نے سہرے کی فرمائش صرف غالبؔ سے کی۔[۲] محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

> ''نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشدزادوں سے چھوٹے تھے مگر بیگم کی خاطر سے ان کی ولی عہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے، غالبؔ مرحوم نے یہ سہرا کہہ کر، زرنگار کاغذ پر لکھ کر، ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلّف کے ساتھ حضور میں گزرانا۔''[۳]

ظاہر ہے کہ یہ بات ذوقؔ کے مدّاحین کو بہت ناگوار گزری ہوگی اور اُنھوں نے ظفرؔ کے کان بھرے ہوں گے۔ مقطعے میں جو چوٹ کی گئی تھی، وہ یوں بھی ظفرؔ کو کھٹکی ہوگی۔ محمد حسین آزاد نے ظفرؔ کی برہمی کا حال اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

''جب سہرا ملاحظہ فرمایا تو مقطعے کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال، بلکہ ملال ہوا۔
استاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ استاد، اسے تو
دیکھو! اُنھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی: پیرومرشد!
درست ۔ بادشاہ نے کہا، تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی: بہت
خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور کہا: مقطع کو بھی دیکھا؟ عرض کی، حضور
دیکھا۔[۴]

ذوقؔ نے غالبؔ کے مقطع کا جواب دیا:

جن کو دعویٰ ہو سخن کا، یہ سنادو اُن کو
دیکھو، اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

غالبؔ جیسے اداشناس آدمی کے لیے بادشاہ کے تیور سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ اُنھوں نے فوراً ایک قطعۂ معذرت لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن اپنی عادت سے مجبور تھے، اس میں یہ شعر بھی لکھ دیا:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے [۵]

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ ذوقؔ کے حسب و نسب کے بارے میں ان کے ہم عصر تذکرے خاموش ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی ان کے والد کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس بعد کے تذکرہ نگاروں میں لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ اُن (ذوقؔ) کے خاندان کے لوگ اب بھی دہلی میں جراحی کا پیشہ کرتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ذوقؔ کسی بڑے خاندان سے نہیں تھے۔ اس لحاظ سے اس شعر میں ذوقؔ کے حسب و نسب پر گہرا طنز ہے۔ ظاہر ہے کہ ظفرؔ کو یہ بات اور بھی ناگوار گزری ہوگی۔ غالب نے سہرے والے تمام معارضے کی تفصیل نواب انوار الدولہ بہادر شفق کو بڑے درد انگیز الفاظ میں لکھی ہے:

''از دیر باز سرِ دستان سرائی اردو ندارم۔ ہمانا از رضا جوئیِ شہریار سلیمان
پیشگار است گاہ گاہ ناگاہ رنگِ ریختہ ریختن، ویژہ بفرمانِ بانوی بلقیس
پرستار است در ریختہ بدین ردیف ناروا دل آویختن مگر در مقطعِ غزل سرِ
مستانہ ہوی زدہ باشم۔ آن یکے کہ گمانِ کمالی کہ نداشت، داشت،

پنداشت کہ روے سخن سوے اُوست۔ در مقطعِ غزلی کہ سرود، بہنجارِ ستیزہ گام زدو دانست کہ گفتارِ مرا پاسخ ساز داد۔ من بہ سیہ مستی ایں تہ جرعہ کہ فرد ریختۂ خامۂ من است۔

ہرچہ در گفتار فخرِ تست، آں ننگِ من است

سرِ سخن فرد و نیاوردم و قطع نظر را دلیلِ قطعی امتیاز شمردم۔"۶

اس خط سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ غالب نے سہرا بانوی بلقیس پرستار (نواب زینت محل) کی فرمایش پر لکھا تھا اور دوسرے یہ کہ معذرتی قطعے میں غالب نے کچھ بھی کہا ہو، ذوق کے فن کے بارے میں ان کی رائے یقیناً بہت بُری تھی۔

یہ سہرے دہلی اردو اخبار کی اشاعت ۲۸/مارچ ۱۸۵۲ء میں چھپے تھے۔ جواں بخت کی شادی ۲/اپریل ۱۸۵۲ء کو ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شادی سے پہلے ہی یہ ہنگامہ ہو چکا تھا۔ اگر حالات معمول پر ہوتے تو ممکن تھا کہ غالب اسی سہرے پر اِکتفا کرتے۔ لیکن بادشاہ کی ناراضی دور کرنے کے لیے انھیں بیس اشعار کا ایک فارسی قطعہ جشنِ شادی اور سواریِ شہ کی مبارک باد میں لکھنا پڑا۔ جس کا مطلع اور آخری شعر یہ ہیں:

بہارِ در چمن انداز گلفشانی کرد
بشاخِ نخلِ تمنا ثمر مبارک باد

ترا بقا و بقا را سعادت ارزانی
مرا دعا و دعا را اثر مبارک باد

معلوم ہوتا ہے کہ قطعۂ اعتذار اور اس فارسی قطعے کا بہادر شاہ ظفر پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اور وہ غالب سے بدستور کبیدہ خاطر رہے۔ اس کا ثبوت وہ قصیدہ ہے جو غالب نے اس واقعے کے لگ بھگ چھ مہینے بعد یعنی اکتوبر میں ظفر کی سالگرہ پر لکھا تھا۔ اس چالیس اشعار کے فارسی قصیدے میں یہ اشعار بھی ہیں:

ردیفِ شعر از آں کردم اختیار گرہ
کہ از من است برابر وی شہر یار گرہ

ایا شہنشہِ کشور کشای دشمن بند

ز بندہ، درِ خم ابرو روا مدار گرہ

کنم بزمِ تو ساز غزل بلند آواز

فگندہ است بدل طرحِ خار خار گرہ

بدلکشائیِ گفتارِ من کہ غالبؔ را

مزن برشتۂ امید زینہار گرہ

از ایں گرہ کہ برابر و زدی، چرا ترسم

کہ در دلت ز صفا، نیست پایدار گرہ[۷]

گویا سہرے والے معرکے کی تلخی کافی دن تک رہی۔تقریباً دو سال بعد یعنی ۱۵رنومبر۱۸۵۴ء کی رات کو جب آخری چہار شنبہ کی تقریب منعقد ہو رہی تھی، شیخ ابراہیم ذوقؔ کی وفات کی خبر دربار میں پہنچی۔ظفرؔ کو اپنے استاد سے دلی محبت تھی۔اس خبر کا جو اثر ان کے دل و دماغ پر ہوا،اس کا حال سلطان الاخبار کی زبانی سنیے:

"گویند کہ ہرگاہ کہ ایں خبرِ تعزیت اثر سامعہ خراش بلکہ جاں تراشِ حضرت خدیو دہلی گردیدہ، با آنکہ دربارِ عام بتقریبِ آخری چہار شنبہ مہیّا و مہذّب و محفلِ جلوسِ سلطانی منعقد و مرتب بود و جمیع ارکانِ دولت و اعیانِ حضرت از بہرِ اقتباسِ انوارِ ملازمتِ والا حاضر بودند، درحال برخاست و فرمود کہ بساطِ نشاط پیچیدہ شود و محفل انبساط موقوف گردد و شاہزادگانِ فرخندہ فال بلند اقبال با سائر ملازمین درگاہ و حاضرینِ بارگاہِ شریک مشایعتِ جنازۂ آن مغفور شوند۔محقق است کہ شاہِ دہلی در ایں ماتم چنداں اشکِ حسرت ریخت و نعرہ زد کہ گاہے چنیں گریہ و نالہ اش بوفاتِ شاہزادگانِ مرزا دارا بخت و مرزا شاہ رخ و مرزا فرخندہ شاہ وغیرہ ندیدہ اند و نشنیدہ۔"[۸]

اس پوری خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفرؔ کو ذوقؔ سے کیسی محبت اور عقیدت تھی، اسی لیے غالب جب ذوقؔ کے فن اور ان کی شخصیت پر حملے کرتے تھے تو ظفرؔ کو کتنا ناگوار گزرتا ہوگا۔ بظاہر اس کا امکان کم ہے کہ غالبؔ کو ذوقؔ کی وفات کا افسوس ہوا ہو۔لیکن اس کے باوجود ذوقؔ اور ظفرؔ

کے تعلقات کے پیش نظر اُنھوں نے ذوقؔ کا قطعۂ وفات کہا، جس میں شاید پہلی اور آخری بار غالبؔ نے اپنے قلم سے ذوقؔ کو خاقانیِ ہند لکھا ہے۔ ذوقؔ کی وفات کے چوتھے دن یعنی ۱۹ رنومبر ۱۸۵۴ء کی اشاعت میں دہلی اردو اخبار میں یہ قطعہ شائع ہوا تھا:

تاریخِ وفاتِ ذوقؔ، غالبؔ!
با خاطرِ دردمند مایوس
خون شد دلِ زار، تا نوشتم
خاقانیِ ہند، مُرد افسوس

غالبؔ نے ذوقؔ کی وفات پر ایک اور قطعہ بھی کہا تھا:

گویند رفت ذوق ز دنیا، ستم بود
کان گوہر گران بہ تہہ خشت و گل نہند
تاریخِ فوت شیخ بود" ذوق جنّتی"
بر قولِ من رواست کہ احباب دل نہند[9]

کچھ ہی عرصے بعد ایک اچھے انسان کی طرح غالبؔ نے ذوقؔ کی طرف سے اپنا دل صاف کرلیا۔ وہ ذوقؔ کی وفات کے چند ہی روز بعد یعنی ۲۳ رنومبر ۱۸۵۴ء کو اپنے دوست منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھتے ہیں:

"یہاں کا حال تازہ یہ ہے کہ میاں ذوق مر گئے۔ حضور والا نے ذوقِ شعرو سخن ترک کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع کا ایک اور اس عصر میں غنیمت تھا۔"

یہ بات قابلِ غور ہے کہ غالبؔ کی زبان سے ذوقؔ کے بارے میں یہ کلمۂ خیر پہلی بار نکلا تھا۔

حواشی

جواں بخت کا سہرا

۱- ۲۵؍مئی ۱۸۵۱ء کو دہلی اردو اخبار (جلد ۱۳۔شمارہ ۲۱) اطلاع دیتا ہے" شقۂ شاہی اس مضمون کا آیا کہ نسبت ازدواج مرزا محمد جواں بخت بہادر کی صبیۂ محمد خان پسرِ نواب احمد قلی خان بہادر سے قرار پائی ہے۔" ۱۱؍اپریل ۱۸۵۲ء کو دہلی اردو اخبار (جلد ۴) نے خبر دی کہ "بالجملہ ۳۱؍مارچ کو خانہ بندی اور یکم ماہِ حال (اپریل) کو برات اور دوسری کو وداعِ عروس، جہیز وغیرہ از طرفِ دلی داد خان بہادر بھی زائد از مخیلۂ خاص و عام نمایاں ہوا۔"

(اس کتاب میں دہلی اردو اخبار کے تمام اقتباسات مولانا امتیاز علی عرشی کے مقالے مطبوعہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۸ء، سے لیے گئے ہیں۔خ۔ا)

۲- زینت محل نے غالبؔ سے نہ صرف سہرے کی فرمائش کی بلکہ شہزادے کی شادی کا رقعہ بھی غالبؔ ہی نے لکھا۔اس کا ثبوت غالب کا وہ خط ہے جس میں اُنھوں نے شادی کا رقعہ لکھنے کے سلسلے میں کچھ سوال کیے ہیں۔اس خط میں مذکور ہے کہ رقعہ صمصام الدولہ کی طرف سے لکھا گیا ہے (صمصام الدولہ نواب زینت محل کے والد تھے)۔اگرچہ خط میں شہزادے کا نام نہیں دیا گیا لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ رقعہ جواں بخت کی شادی کا تھا۔(غالب کی نادر تحریریں، ص ۳۱)

۳- دیوانِ ذوقؔ: ۲۵۷

۴- دیوانِ ذوقؔ: ۲۵۸

۵- دہلی اردو اخبار کی ۲۸؍مارچ ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں یہ مصرع اس طرح ہے۔

علم و کمال و فضل سے نسبت نہیں مجھے

۶- کلیاتِ نثرِ غالبؔ: ۲۲۵

۷- یہ قصیدہ دہلی اردو اخبار کی ۱۰؍اکتوبر ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں شامل ہوا۔'کلیاتِ نظمِ غالب'، مطبوعہ نول کشور ۱۸۶۳ء میں یہ قصیدہ شامل ہے۔

۸- سلطان الاخبار، بحوالۂ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۸ء، :۲۴۔۲۵

۹- غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۱۵۷

قلعے میں ملازمت

ظفرؔ اور غالبؔ کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اور زیادتی بھی غالبؔ ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ایک موقع پر ظفرؔ نے غالبؔ کا ساتھ دے کر اپنی وسیع القلبی کا ثبوت دیا۔ ہوا یوں کہ ۲۵ رمئی ۱۸۴۷ء کو غالبؔ جوئے کے الزام میں گرفتار[1] ہو گئے۔ ظفرؔ چاہتے تو اس معاملے میں خاموش رہتے۔ لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ انگریز ریذیڈنٹ کو خط لکھ کر غالبؔ کی سفارش کی۔ 'احسن الاخبار' ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء کی اشاعت میں درباری مصروفیات کے تحت یہ خبر دی گئی ہے:

> ''مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ بہادر شاہ ظفرؔ نے معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی بھی لکھی کہ ان کو رہا کر دیا جائے کہ یہ معززینِ شہر میں سے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے، محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالتِ فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر، نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے، ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔''[2]

اگر چہ ظفرؔ کی سفارش بے کار گئی، لیکن یہ ان کی عظمت کا ثبوت ضرور ہے۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد یعنی ۴ رجولائی ۱۸۵۰ء (مطابق ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ) کو ظفرؔ نے غالبؔ کو خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر کر دیا۔ اس واقعے کی تفصیل خود غالبؔ کی زبانی سنیے، جو اُنھوں نے 'مہر نیم روز' کے دیباچے میں لکھی ہے۔[3]

> ''میں سفر کرنے والے ٹھہرے ہوئے۔ وہ دن مبارکی کی وجہ سے سعدِ اکبر کے نام سے موسوم اور پنجشنبہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اور ۲۳ رشعبان ۱۲۶۶ھ مطابق ۴ رجون ۱۸۵۰ء تھا۔ آفتاب خرگاہِ

ماہ (برج ثور) میں مہمان تھا اور چاند نشین زہرہ (برج حوت) سے مہمان کو نگاہِ محبت سے دیکھ رہا تھا۔ کیوان برج حمل میں رہ نورد اور مُشتری برج سنبلہ میں خراماں، مریخ برج اسَد میں زہرہ کے ساتھ اور عطارد جوزا میں تنہائی پر شاداں۔ شہنشاہ ایسے دبدبے کے ساتھ کہ گویا آفتاب ہے۔ بیت الشرف میں تخت پر جلوہ افروز اور میں ایسی خوشی کے ساتھ کہ گویا عطارد ہوں، صمیم دل سے روبرو کھڑا ہوں۔ شاہی کارکن مجھے بادشاہ کے حکم سے خلعت خانے میں لے گئے اور میرے قامت کو خلوت شش پارچہ سے آراستہ کر کے سلام گاہ میں لائے۔ دنیا و دیں کے بادشاہ نے اس بخشش آمیں ہاتھ سے کہ جس کی ہتھیلی ایسا دریا ہے کہ سات دریا اس کے مقابلے میں کفِ آب (جھاگ) ہیں، جگر گوشہ ہائے معدن یعنی جیغہ اور سرپیچ میرے سر پر باندھا اور رگِ جانِ ابرنیساں یعنی موتیوں کی حمائل میری گردن میں ڈالی۔ نقیب مبارک سروش نے بادشاہِ ستارہ سپاہ کے ابر خامہ کی رگوں سے ٹپکے ہوئے موتی بساطِ بارگاہ کے گوشے پر بکھیر دیے۔ اور غالبؔ سخن سرا کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کے خطاب سے پکارا۔ اس خطاب سے جو میں نے ذرّہ نواز آفتاب سے پایا۔ کیوں کر کہوں کہ اپنے آپ کو آفتاب کے برابر، البتہ عطارد کا ہم پلّہ پایا۔ شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا فرمان میرے نام صادر ہوا۔[۵]

غالبؔ نے جن الفاظ میں خلعت اور خطابات ملنے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے لیے یہ تقرر باعثِ فخر تھا۔ جس دن غالبؔ خلعت اور خطابات سے سرفراز ہوئے ہیں۔ اسی دن اُنھوں نے نواب محمد مصطفٰے خاں شیفتہؔ کو ایک خط میں اس کی تفصیل لکھی ہے، جس سے ایک اور حقیقت کا پتا چلتا ہے۔ وہ یہ کہ غالبؔ کو بادشاہ کے دربار میں ۵ر جولائی بروز جمعہ حاضر ہونا تھا لیکن حکیم احسن اللہ خاں نے ایک دن پہلے ہی بلوالیا۔ مزید یہ کہ تقرر کے وقت غالبؔ بددلی کا شکار تھے اور حادثۂ اسیری سے ان کی جو رُسوائی اور ذلّت ہوئی تھی، اس کا اثر ابھی تک ان کے ذہن پر تھا۔ خط ملاحظہ ہو:

روزِ چہار شنبہ یعنی دیروز عرضہ داشتہ ام کہ روزِ آدینہ بارم می دہند و بعطائے خلعت و خطاب و توقیع نوکری برمن سپاس می نہند۔ احترام الدولہ بہادر (حکیم احسن اللہ خاں) بمقتضائے فحوائے ایں فرد۔

فرداست وعدۂ جنّت و امروز شد نصیب
آرے خلافِ وعدہ کریماں چنیں کنند

ہم امروز کہ روزِ سعدِ اکبر است مرا بہ بزمِ خسروی خواندو کامیابِ خطاب و خلعت و فرمانم گرداند۔ دی شحنۂ شہر "بدمعاش" و میر بساطم نوشت و از من ہیچ نکاست، امروز بادشاہِ دہلی نجم الدولہ و دبیر الملک خواند و بر من ہیچ نیفزود۔ کار بافرداست، تادراں روزم چہ نویسند و بکدام نامم خوانند و دراں چہ ارزم بود...... تاریخِ نوکریِ من در سرکارِ شاہ بعہدۂ تاریخ نویسیِ اسلافِ این خاندان بمشاہرۂ پنجاہ روپیہ، یکم ہمین ماہ است۔ یعنی وصولِ زرِ تن خواہ درسالے دوبار است۔[6]

شاہی ملازمت ملنے پر غالبؔ نے یہ غزل بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
کس واسطے، عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرّد و زر و گوہر، نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر، نہیں ہوں میں
غالبؔ! وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے: "نوکر نہیں ہوں میں"[7]

اکثر شارحینِ غالبؔ نے پانچویں، چھٹے اور ساتویں شعر کو نعتیہ قرار دیا ہے اور محققینِ غالبؔ نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی، حالاں کہ اس کا قوی اِمکان ہے کہ ان تمام اشعار میں غالبؔ کے مخاطب صرف بہادر شاہ ظفر ہوں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ غالبؔ نے شاہی ملازم ہونے پر یہ غزل ظفرؔ کی خدمت میں پیش کی تھی جس کا ذکر اُنھوں نے خود نواب کلب علی خاں کے نام ایک خط میں کیا ہے۔

اس غزل میں اُنھوں نے اپنی پریشان حالی کا ذکر کیا ہے، اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا ہے اور بادشاہ کی اُس بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے جو وہ اب تک غالب سے برتتے رہے تھے۔ آخری پانچ شعر غالب اور ظفر کے تعلقات کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں۔

تیموریہ خاندان کی اس تاریخ کا نام 'پرتوستان' رکھا گیا اور اسے دو حصّوں میں لکھا جانا تھا: پہلا مہرِ نیم روز۔ آغازِ روزگار سے ہمایوں بادشاہ تک۔ دوسرا، ماہِ نیم ماہ: اکبر سے ظفر تک۔ پہلا حصّہ ۱۲۷۱ھ میں فخر المطابع سے شائع ہوا تھا، دوسرے کے لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

پہلی ششماہی ختم ہونے پر غالب نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ماہ بماہ تنخواہ کی درخواست کریں گے اور اگر یہ درخواست منظور نہ ہوئی تو اس خدمت سے سبک دوش ہوجائیں گے۔ ۲رجنوری ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:

> ''اب چھ مہینے پورے ہو چکے، جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک۔ اب میں دیکھوں یہ ششماہہ مجھے کب ملتا ہے! بعد اس کے ملنے کے، اگر آئندہ ماہ بماہ کردیں گے تو میں لکھوں گا، ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے۔'' [۸]

غالب نے اس سلسلے میں بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں ایک منظوم درخواست پیش کی تھی۔ یہ درخواست اُن کا وہی مشہور قطعہ ہے جس کا پہلا مصرع ہے:

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ!

غالباً اُن کی یہ درخواست قبول ہوگئی اور انھیں ماہ بماہ تنخواہ ملنے لگی تھی کیوں کہ اس کے بعد بھی حسبِ سابق کام کرتے رہے۔

یہاں اُن چند فارسی اشعار کا ذکر بھی ضروری ہے جو غالب نے 'مہرِ نیم روز' کے دیباچے میں شاعرانہ تعلّی کے طور پر لکھے ہیں۔ سہرے پر اتنے بڑے ادبی معرکے کی ایک وجہ سہرے کا وہ مقطع بھی تھا جس میں غالب نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا تھا۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ وہ آیندہ اس طرح کی تعلّی سے گریز کرتے، لیکن مشکل یہ تھی کہ غالب خود کو اپنے عہد کا سب سے بڑا فن کار سمجھتے تھے جو حقیقت بھی تھی۔ اسی لیے جب بھی موقع ملتا وہ اپنا یہ حق منوانے پر اِصرار کرتے۔ اس معاملے میں ان کی خاص توجہ بہادر شاہ ظفر پر تھی۔ کیوں کہ وہ کچھ بھی سہی، تھے تو بادشاہ......

'مہرِ نیم روز' کے دیباچے میں غالب کے یہ فارسی اشعار ملاحظہ ہوں۔

بچشم کم منگر گرچہ خاکِ راہِ توام
کہ آبروی دیارم دریں خلافت گاہ
کمال بین کہ بدین غصہ ہای جاں فرسا
ہنرنگر کہ بدین فتنہ ہای طاقت کاہ
مربی سخنم من بمایہ داری فکر
ز نطق من بودش عیش ہای خاطر خواہ
باخذ فیض زمبدا فزونم از اسلاف
کہ بودہ ام قدری دیر تر دراں درگاہ
نزول من بجہاں بعد یک ہزار و دویست
ظہورِ سعدی و خسرو بہ ششصد و پنجاہ
سخن ز نکتہ سرایانِ اکبری چہ کنی
چومن بخوبی عہد توام ز خویش گواہ
کنوں تو شاہی و من مدح گو تعال تعال
گذشت دورِ نظیری و عہدِ اکبر شاہ
بفنِ شعر چہ نسبت بمن نظیریؔ را
نظیر خود بہ سخن ہم فہم سخن کوتاہ

۱۸۵۴ء میں ولی عہد مرزا فخرو، غالبؔ کے شاگرد ہوئے تو اُنھوں نے غالبؔ کا چار سو روپے سال مقرر کر دیا۔ غالبؔ کی بدنصیبی کہ ولی عہد اس تقرر کے دو سال بعد ہی وفات پا گئے۔

حواشی

قلعے میں ملازمت

۱- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ذکرِ غالب، ۱۰۵-۱۱۰

۲- احسن الاخبار، بمبئی (۲۵/جون ۱۸۴۷ء) بحوالہ دہلی کا آخری سانس، ۱۷۱

۳- مہرِ نیم روز (مشمولہ کلیات نثرِ غالب)

۴- غالبؔ سے سہو ہوا ہے۔ یہ مہینہ جولائی کا تھا، جون کا نہیں۔ (خ۔ا)

۵- مہرِ نیم روز (اردو ترجمہ): ۸۷

۶- تلاشِ غالب: ۱۴۲

۷- ایک مدت بعد غالبؔ نے نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کو ایک خط میں لکھا۔ ''بعد تسلیم عروض ہے جب بادشاہِ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاریِ سلطانِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے ''غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا'' اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ حضرت کو پسند آئے۔''

غالبؔ نے اس غزل کے مقطع کو بدل کر اس طرح قطعہ کر دیا:

در پہ امیرِ کلب علی خاں کے ہوں مقیم
شائستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں اسد
خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

(مکاتیب غالبؔ) چھٹا اڈیشن: ۵۳

۸- غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۰۹۴

غالبؔ اور قلعے سے متعلق کچھ واقعات

یوں تو 'غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ' کے عنوان سے یہ پوری کتاب 'غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ' کے تعلقات پر مبنی ہے، لیکن پھر بھی کچھ واقعات ایسے ہیں جو کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے یا جو اتنے اہم تھے کہ انھیں نقل کیا جائے۔ یہ سارے واقعات یہاں بیان کیے گئے ہیں۔

غالبؔ اور ظفرؔ کے تعلقات

غالبؔ نے ایک خط میں بہادر شاہ ظفرؔ سے اپنے تعلق کی نوعیت سرسری بتائی ہے لیکن ان کا یہ خط ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد کا ہے، ورنہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ ظفرؔ سے اپنے تعلقات کو سرسری نوعیت کا بتانا برطانوی حکومت سے اپنی مدافعت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں بہادر شاہ ظفرؔ سے بہت قربت حاصل تھی اور ظفرؔ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ قلعے میں جو لوگ ممتاز ترین عہدوں پر فائز تھے۔ غالبؔ کی عزت اور توقیر اُن سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

۶/اپریل ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں میر مہدی مجروحؔ کو غالبؔ نے لکھا تھا۔

> "پادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں تھی۔ مگر فائدہ وہی قلیل۔"[۱]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ۱۸۳۴ء میں غالبؔ نے ظفرؔ کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا اور جس میں بالواسطہ طور پر شہزادہ سلیم کی تعریف کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ولی عہدی کی بہتر صلاحیتیں ظفرؔ میں نہیں شہزادہ سلیم میں ہیں۔ جب کہ اکبر شاہ ثانی شہزادہ سلیم کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ غالبؔ کا یہ قصیدہ ظفر اور شہزادہ سلیم دونوں کو ناگوار گزرا ہوگا۔ اس قصیدے کی تفصیل اس کتاب کے شروع میں دے دی گئی ہے۔ کم سے کم دو قطعوں میں غالبؔ نے ایسے شعر کہے ہیں جن سے ذوقؔ پر چوٹ کی گئی تھی۔ اس سب کے باوجود بہادر شاہ ظفرؔ نے غالب سے بدلہ نہیں چکایا بلکہ

جب غالبؔ ۲۵ رمئی ۱۸۴۷ء قمار بازی کے الزام میں دوبارہ گرفتار کیے گئے تو ظفرؔ نے انگریز ریذیڈنٹ معظم الدولہ بہادر کو خط لکھ کر سفارش کی کہ غالبؔ کو رہا کر دیا جائے۔ بمبئی سے شائع ہونے والے 'احسن الاخبار' کے ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء کے شمارے میں درجِ ذیل خبر شائع ہوئی:

''مرزا اسداللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی بھی لکھی گئی کہ ان کو رِہا کر دیا جائے کہ یہ معززینِ شہر میں سے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے، محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالتِ فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر تھے، نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے، ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔''[۲]

۲۳ رشعبان ۱۲۶۶ھ مطابق ۴ رجون ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ ظفرؔ نے غالبؔ کو تیموریہ خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ اس موقع پر غالبؔ کو ظفرؔ نے جس طرح عزت و احترام کے ساتھ نوازا تھا۔ اس کی تفصیل لکھی جا چکی ہے۔[۳]

غالبؔ نے چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام نومبر ۱۸۶۰ء کے خط میں لکھا ہے:

''بادشاہِ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا۔ اُن کے ولی عہد (مرزا فخرو) نے چار سو روپے سال، ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے...... دلّی کی سلطنت سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔''[۴]

بہادر شاہ ظفرؔ شاہ پسند دال اور بیسن کی روٹی تحفتہً جن بعض درباریوں کو بھیجتے تھے، اُن میں غالبؔ بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود غالبؔ نے ۱۸۵۷ء کے بعد کئی خطوط میں اور 'دستنبو' میں بار بار یہ لکھا ہے کہ میرا قلعے سے سرسری تعلق تھا۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ روزانہ نہیں تو اکثر قلعے جاتے تھے۔

غالبؔ صبح کے وقت ظفرؔ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دفعہ اتنے زور کی بارش ہوئی کہ غالبؔ کے لیے گھر سے نکلنا ناممکن ہوگیا۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

''صبح ہوتے وہ پانی پڑا کہ جل تھل بھر گئے۔ قلعے نہیں جا سکا۔ مینہہ برس رہا ہے اور میں یہ خط لکھ رہا ہوں، اگر یہی عالم ہے تو آج اس خط کو نہیں بھیج سکوں گا۔ بڑے زور سے مینہہ برس رہا ہے۔''[۵]

قلعے میں غالبؔ کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ غالبؔ نے ۱۸۵۷ء سے قبل ایک خط میں قدرؔ بلگرامی کو لکھا تھا:

''کاش آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے تو جانتے۔ ہر روز صبح کو قلعے جانا۔ بعد کھانا کھانے کے حضرت (بہادر شاہ ظفرؔ) کے مسودوں کا درست کرنا۔''[۶]

غالبؔ نے حقیرؔ کے نام ۲۳ر جنوری ۱۸۵۴ء کے خط میں لکھا ہے:

''وہ مثنوی اور اعلام نامہ میں نے تمھارے پاس بھجوایا ہے۔ وجہ یہ کہ جب حضور نے حکم دیا کہ عمائد اہلِ تسنن جو اطراف و جوانب دہلی میں ہیں، ایک ایک نقل اُن کو بھیجی جائے۔ میں نے دفتر میں بہ قیدِ علی گڑھ کول مفتی صدرالدین خاں صاحب کا، اور تمھارا نام لکھوا دیا اور کالپی میں نواب انورالدولہ اور بریلی میں سیّد احمد کا نام لکھوا دیا اور کوئی ایسا سنّی گراں مایہ میرے ہاتھ نہ آیا۔''[۷]

اس اجمال کی پوری تفصیل 'ظفرؔ اور شیعیت' کے عنوان کے تحت لکھی جا چکی ہے۔ یہاں مختصراً بتایا جاتا ہے کہ آخری عمر میں ظفرؔ کا شیعیت کی طرف رجحان ہو گیا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ 'دہلی اردو اخبار' کی ۹ر اکتوبر ۱۸۵۴ء کی اشاعت میں خبر دی گئی کہ ''جمعرات کو علَم جو حضورِ والا نے تیار کروایا ہے، وہ بہت خوب صورت بن کر آیا ہے۔ حضورِ والا نے کمال آداب و قرینے سے اپنے سرِ مبارک پر رکھا اور صاحب مرزا نورالدین بہادر کو وہ علَم سپرد کر کے بہ سبیلِ ڈاک لکھنؤ کو رخصت کیا۔'' برطانوی حکومت اور دہلی کے عوام و خواص کے دباؤ پر بہادر شاہ ظفرؔ نے تردید کی کہ وہ شیعہ ہو گئے ہیں۔ ایک مثنوی کے ذریعے ظفرؔ نے شیعی عقیدہ اختیار کرنے کی تردید کی۔ اس مثنوی کے بارے میں عام خیال ہے کہ اس کے مصنف غالبؔ تھے۔ اس مثنوی کے ساتھ ایک اعلام نامہ بھی تیار

کیا گیا جو دہلی سنی حضرات میں تقسیم کیا گیا۔ یہ اعلام نامہ بھی غالباً غالبؔ کا لکھا ہوا تھا۔

اگر چہ غالبؔ نے ۱۴ رجنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں نواب یوسف علی خاں سے خود اعتراف کیا ہے کہ ''لال قلعے سے اُن کا تعلق سات آٹھ سال کا تعلق تھا۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

> ''بہادر شاہ ظفرؔ سے میرا تعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ سات آٹھ سال سے سلاطینِ تیموریہ کی تاریخ لکھنا (مامور) تھا اور دو تین سال سے بادشاہ کے اشعار کی اِصلاح دیا کرتا تھا۔ اس ہنگامے (انقلاب ۱۸۵۷ء) میں، میں نے خود کو علاحدہ کرلیا اور اس خیال سے کہ اگر میں نے (بہادر شاہ ظفرؔ اور لال قلعے) سے ایک دم تعلق ختم کرلیا تو میرا گھر برباد کردیا جائے گا اور میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں بظاہر تو آشنا رہا لیکن بہ باطن بیگانہ تھا۔''

غالبؔ نے 'دستنبو' میں اپنی صفائی میں ایک خاصا طویل بیان دیا ہے۔ 'دستنبو' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کے پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ میں نے، جس کے قلم کی جنبش سے کاغذ پر (الفاظ کے) موتی بکھر جاتے ہیں، بچپن سے انگریزی حکومت کے نان ونمک سے پرورش پائی ہے اور جب سے منہ میں دانت نکلے ہیں ان فاتحین عالم کے دسترخوان کا ریزہ چیں ہوں۔ سات آٹھ سال ہوئے کہ بادشاہِ دہلی نے مجھ کو بلایا اور مجھ سے فرمایش کی کہ میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں، جس کے عوض (۶۰۰) چھ سو روپے سالانہ دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کرلیا اور کام میں مشغول ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے پرانے استاد کا انتقال ہوگیا اور اصلاحِ شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کردیا گیا۔
>
> میں بوڑھا اور کمزور تھا، نیز گوشۂ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے مجلس میں حاضرین کے لیے بارِ خاطر ہو جاتا تھا، کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں (کی جنبش) پر نظر جمائے ہوئے ہوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو کچھ دیر حاضرِ خدمت رہتا ورنہ دیوانِ خاص میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آتا تھا۔

اس مدت میں جتنا کام مکمل ہو جاتا، اس کو اپنے ساتھ لیے جاتا تھا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا تھا۔ یہ تھا میرا پیشہ، فکر اور کام۔ لیکن یہ تیز رفتار آسمان اس خیال میں محو تھا کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتب کرے اور میرے اس سکون کو، جس میں آسایش و فراغت کا کوئی حصہ نہیں تھا اور جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک تھا، تباہ کردے۔[۸]

غالبؔ نے اپنی نظم اور نثر دونوں میں بارہا یہ شکایت کی ہے کہ ان کے کلام کی وہ قدر نہیں ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ ایک روز غالب لال قلعے سے سیدھے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گھر آئے اور بقول مولانا حالیؔ کہنے لگے کہ:

''آج حضور (بہادر شاہ ظفرؔ) نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارک باد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا۔ جب قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا (مرزا تم پڑھتے خوب ہو) اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی ناقدری پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔''[۹]

مغل خاندان کے افراد کو جب رنگون بھیجا گیا تو غالبؔ نے 'دستنبو' میں شاہی افراد کے سفرِ رنگون کے مختصر ترین حالات لکھے ہیں جو درجِ ذیل ہیں:

''بادشاہ (ظفرؔ) کی روانگی کا حال کیوں کر (لکھوں)...... بادشاہ اکتوبر میں گئے۔''

''بادشاہ، میرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ (بہادر شاہ ظفرؔ کے ایک فرزند جو جواں بخت سے چھوٹے تھے) زینت محل، کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی۔ دیکھیے کیپ[۱۱] میں رہیں یا لندن جائیں۔''[۱۰]

تاج محل (بہادر شاہ کی ایک بیگم)، مرزا قیصر (شاہ عالم ثانی کے چھوٹے بھائی، میرزا سلیمان شکوہ کے فرزند) مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہوگئی ہے۔[۱] مطلب یہ کہ انھیں اجازت مل گئی، چاہیں ہندوستان میں

رہیں، چاہیں بادشاہ کے ساتھ جائیں۔''[11]

غالبؔ نے 'دستنبو' میں بہادر شاہ ظفرؔ اور شہزادوں کے انجام کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے غالبؔ 'دستنبو' میں تحریر فرماتے ہیں:

''اور یہ جو بادشاہ اور شاہ زادوں کے انجام کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا (حالاں کہ ان واقعات کو) فتحِ شہر کی داستان کے دیباچے کے طور پر (آغاز ہی میں) لکھنا چاہیے تھا۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شنیدہ ہیں اور ابھی بغیر سنی ہوئی باتیں بہت ہیں یقیناً جب میں اس جائے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سنی ہیں اِدھر اُدھر سے جمع کروں گا اور تب واقف کاروں کی طرح یہ راز کی باتیں لکھوں گا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے (واقعات) داستان کی تقدیم و تاخیر پر از روے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔''[12]

غالبؔ کے مربّی اور محسن بہادر شاہ ظفرؔ کا جب انتقال ہوا تو غالبؔ اس جانکاہ حادثے پر کُھل کر ماتم بھی نہیں کر سکے۔ اُنھوں نے ۱۶/دسمبر ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں میر مہدی مجروحؔ کے نام بس اتنا لکھا:

''۷/نومبر ۱۴ جمادی الاوّل سالِ حال جمعے کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رِہا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔''[13]

شیونرائن آرامؔ نے غالبؔ سے فرمائش کی کہ وہ بہادر شاہ ظفرؔ کی ایک تصویر کہیں سے فراہم کر کے اُنھیں بھیج دیں۔ غالبؔ نے کوشش کی لیکن اُنھیں ظفرؔ کی تصویر نہیں ملی۔ غالبؔ نے منشی شیونرائن آرام کے نام ۲۳/اکتوبر ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھا ہے:

''بادشاہ (ظفر) کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اُجڑا ہوا شہر، نہ آدمی، نہ آدم

زاد، مگر ہاں دو ایک مصوروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے، وہ رہتے ہیں، سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں، تصویریں بھی اُن کے گھروں سے لُٹ گئیں۔ جو کچھ رہیں، وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کرلیں۔ ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں، تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اُتار دے، اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے پھر خدا جانے اچھی ہو یا نہ ہو۔ اتنا صرفِ بیجا کیا ضرور ہے۔ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے، اگر کہیں سے ہاتھ آجائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مصوروں سے خرید کرنے کا نہ خود میں مقدور، نہ تمھارا نقصان منظور۔'' [۱۴]

غالبؔ کی حسِ مزاح بہت تیز تھی۔ وہ غضب کے حاضر جواب بھی تھے۔ موقع ملتے ہی اُن کی حسِ مزاح جاگ جاتی تھی۔ وہ ظفر سے بھی مذاق کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ حالی نے 'یادگارِ حالی' میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ:

بہادر شاہ ظفرؔ کے ساتھ ایک لطیفہ

آموں کا موسم تھا۔ بہادر شاہ ظفر اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ باغِ حیات یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ ان مصاحبوں میں غالب بھی شامل تھے۔ ان باغوں کے آم صرف باشاہ، سلاطین اور بیگمات کے علاوہ کسی کو میّسر نہیں آسکتے تھے۔ غالبؔ آموں کی طرف بار بار دیکھتے اور ہر آم کو غور سے دیکھتے۔ ظفر نے غالب سے پوچھا۔ اتنے غور سے آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ مرزا نے دست بستہ عرض کیا۔ کسی بزرگ نے فرمایا ہے:

برسرِ ہر دانہ بے نوشتہ عیاں
کایں فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں

اس شعر کا اردو ترجمہ ہے'' ہر دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام''۔ غالبؔ

نے ظفرؔ سے کہا۔۔حضور! یہ دیکھ رہا ہوں کہ کسی دانے پر میرا یا میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ ظفر یہ سن کر مسکرا دیے اور اُسی دن ایک بہنگی اعلا درجے کے آموں کی مرزا کے گھر بھجوادی۔''

حالیؔ نے یادگارِ غالبؔ میں لکھا ہے:

''ایک دفعہ رمضان گزر چکا تو غالبؔ سے بادشاہ نے پوچھا،''مرزا تم نے کتنے روزے رکھے۔عرض کیا۔ پیرومرشد ایک نہیں رکھا۔''[۱۵]

حواشی

غالبؔ اور قلعے سے متعلق کچھ واقعات

۱- غالبؔ کے خطوط:۲:۵۱۹

۲- احسن الاخبار، بمبئی، ۲۵/جون ۱۸۴۷ء، بحوالہ کچھ غالبؔ کے بارے میں، حصہ دوم، قاضی عبدالودود، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، 1995: ۵٦۷_۵٦۸

۳- مہر نیم روز: ۸۷

۴- غالبؔ کے خطوط:۲:٦۰۹_٦۱۰

۵ غالبؔ کے خطوط:۳:۱۱۳٦

٦ غالبؔ کے خطوط:۴:۱۴۱۸

۷ غالبؔ کے خطوط:۳:۱۱۳۹

۸ دستنبو:۸

۹ غالبؔ کے خطوط:۲:۵۳۹

۱۰ غالبؔ کے خطوط:۳:۱۰۵۷

۱۱ غالبؔ کے خطوط:۲:۵۰۰

۱۲ غالبؔ کے خطوط:۲:۵۳۹

۱۳ غالبؔ کے خطوط:۳:۱۰۵۷

ظفؔر کی شیعیت اور غالبؔ

اپنے آباواجداد کی طرح ظفؔر بھی عقیدے کے اعتبار سے سُنّی تھے لیکن آخری عمر میں شیعیت کی طرف ان کا رجحان ہوگیا تھا۔ جب بادشاہ کے اس اقدام کی ہر سطح پر مخالفت ہوئی تو انھیں مجبوراً اس خبر کی تردید کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں بادشاہ کے نام سے ایک فارسی مثنوی شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ بادشاہ بدستور سُنّی ہیں اور ان کے شیعی مذہب اختیار کرنے کی خبر قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ ایسی شہادت موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی غالبؔ کی تصنیف ہے۔ اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ مذہبی اعتبار سے ظفؔر راسخ العقیدہ نہیں تھے۔ بعض حلقوں میں یہ مشہور تھا کہ وہ بدعتی ہیں۔ سر سیّد لکھتے ہیں:

> ''دلّی میں ایک بڑا گروہ مولویوں کا اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رُو سے معزول بادشاہِ دلّی کو بہت بُرا اور بدعتی سمجھتا تھا۔ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ دلّی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبضہ و دخل اور اہتمام ہے، ان مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چناں چہ وہ جامع مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملے میں موجود ہیں۔''[1]

۱۸۵۳ء میں ظفؔر ایسے بیمار ہوئے کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بقول اسپئیر:

> ''سنہ ۱۸۵۳ء میں ان (بادشاہ) پر انتڑیوں کی بیماری کا حملہ ہوا اور وہ ابھی اس سے پوری طرح شفایاب نہیں ہونے پائے تھے کہ کثرتِ عیاشی نے انھیں موت کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا۔''[2] (انگریزی سے ترجمہ)

غالبؔ نے بادشاہ کی اس بیماری کا حال منشی نبی بخش حقیرؔ کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

''بادشاہ کا حال کیا پوچھتے ہو اور اگر تم نے پوچھا ہے تو میں کیا لکھوں۔ دست موقوف ہو گئے مگر کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔ تپ جاتی رہی مگر گاہ گاہ حرارت ہو آتی ہے۔ ہچکی اس شدّت کی نہیں رہی۔ گاہ گاہ چھاتی جلتی رہتی ہے اور ڈکاریں آتی ہے۔ ہوادار پلنگ کے برابر لگا دیتے ہیں اور حضرت کو پلنگ پر سے ہوادار پر بٹھا دیتے ہیں۔ اس ہیئت سے برآمد بھی ہوتے ہیں۔ قلعہ ہی قلعہ میں پھر کر، پھر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یوں تصوّر کیجیے اور مشہور بھی یوں ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے۔ بہرحال جب تک سلامت رہیں، غنیمت ہے۔''[۳]

بیماری کے دوران بہادر شاہ ظفرؔ کو بقول اُن کے بشارت ہوئی کہ وہ حضرت عبّاس کی درگاہ میں علَم چڑھائیں۔ مرزا حیدر شکوہ نے ایک خط میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''میں کلکتہ میں تھا اور مجھے شاہی شقہ پہنچا، جس میں خواب کا بیان اور حضرت کی درگاہ میں علَم چڑھانے کا مذکور تھا۔ اس کے بعد جب میں حاضر ہوا تو پھر خواب دیکھنے کا حال بیان فرمایا اور اہلِ بیت کی محبت کا اظہار اور تعمیرِ امام باڑہ کا قصد برائے تعزیہ داریِ سیّد الشہدا مثل اپنے جدِ اعلیٰ امیر تیمور صاحب قراں بیان کیا۔''[۴]

بادشاہ نے صحت یاب ہو کر واقعی حضرت عبّاس کی یادگار پر علَم چڑھانے کی تیاری شروع کر دی۔

دہلی اردو اخبار اس واقعے کی خبر ان الفاظ میں دیتا ہے:

''چہار شنبہ کو حضور والا نے نقشہ ایک علَم کا بہت تحفہ اپنے ہاتھ سے مع طغرای اسمِ مبارک جناب حضرتِ عبّاس علیہ السلام کے کھینچ کر کاریگروں کو دیا اور حکم ہے کہ جلد تیار ہو اور صاحب عالم مرزا نور الدین بہادر سے حضور والا نے فرمایا کہ تم جا کے لکھنؤ میں با آدابِ شائستہ درگاہ میں جناب حضرت عباس علیہ السلام کے چڑھا کے جلد پھر حضور میں حاضر ہو، سنا جاتا ہے کہ اس کی بشارت ہوئی تھی، حضورِ والا کو......''[۵]

دہلی اردو اخبار کے اسی شمارے میں بادشاہ کے بارے میں یہ خبر بھی شائع ہوئی ہے کہ ''عنقریب

غسلِ صحت اور جشنِ صحت ہووے۔'' کچھ دن بعد دہلی اردو اخبار نے بادشاہ کے ایک مجلس میں شریک ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''بدھ کے دن مرزا عالی بخت کے مکان میں (بادشاہ) شریکِ مجلس ہوئے اور دیر تک مرثیے سنے اور آپ بھی فضیلتِ ائمہ بیان کرتے رہے اور جمعرات کا علَم جو حضورِ والا نے تیار کروایا ہے اور وہ بہت خوب صورت بن کر آیا ہے۔ حضورِ والا نے کمالِ آداب و قرینے سے اپنے سرِ مبارک پر رکھا اور صاحب عالم مرزا نورالدین[6] بہادر کو وہ علَم سپرد کر کے بہ سبیل ڈاک لکھنؤ کو رخصت کیا۔ ہر چند علَمِ مبارک کے بنانے پر اکثر آلِ تیمور مغفور مانع بھی رہے مگر حضور نے کسی کی بھی نہیں سنی اور جو ذہنِ مبارک میں آیا، وہی کیا، بعض لوگ اس بات سے بھی بہت رنجیدہ ہوئے کہ حضورِ والا سے اُن کے برخلاف یہ امرِ جلیل ہوا ہے بلکہ حضورِ والا نے اکثر اپنی زبانِ مبارک سے حاضرین دربارِ معلّیٰ سے فرمایا کہ اکثر آلِ تیموری اور دیگر اشخاص نے مجھ سے عرض کی اس علَم مبارک بنانے میں اور لکھنؤ بھیجنے میں آپ رافضی مشہور ہوں گے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھ کو الفتِ پنجتن پاک میں سب باتیں منظور ہیں۔ اگر ان کی محبت سے آدمی رافضی ہوتا ہے تو جو جس کا جی چاہے کہے، کہنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔''[7]

اسی دوران میں بہادر شاہ ظفر نے لکھنؤ کے مجتہد العصر سلطان العلما سید محمد صاحب کو ایک خط میں لکھا:

''اللہ کا شکر ہے کہ محبتِ اہلِ بیتِ علیہم السلام دل سے میں نے اختیار کی ہے اور حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں سے قطعی تبرّا کیا ہے۔ امام باڑے کی تعمیر شروع ہوگئی ہے۔ عمارت تمام ہو جانے کے بعد جناب سیّدالشہدا کی مجالسِ تعزیت ہوا کریں گی۔ میری کوشش ہے، اتمام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ مفصّل مدارج دین کے جن پر میں راسخ ہوں، مرزا محمد حیدر شکوہ کی زبانی معلوم ہوں گے، وہ اس معاملے میں راز دار ہیں۔''[8]

اس کا مطلب یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے نہ صرف علَم تیار ہونے کے لیے بھیجا بلکہ دلّی میں ایک امام باڑے کی تعمیر بھی شروع کر دی تھی۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ امام باڑہ بنا کہاں شروع ہوا تھا

اور کس منزل پر اس کی تعمیر روکی گئی تھی۔

> "جب علَم چڑھانے میں تاخیر ہوئی تو ظفر نے مرزا نورالدین بہادر کو لکھا۔ علَم جلد درگاہِ حضرت عباسؓ میں چڑھا کر حاضر ہو۔ معلوم نہیں کہ تم نے علَم چڑھایا یا نہیں۔ طمعِ دنیا کے لیے یہ علَم پیش نہیں کیا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے کیا دیکھ کر علَم بھیجا ہے۔"[9]

دہلی کے ایجنٹ امین الدولہ سائمن فریزر دلیر جنگ کے ایک خط بنام جانشین ایجنٹ اودھ سے پتا چلتا ہے کہ:

> "چھٹی ربیع الاوّل (۱۲۷۰ھ) سنہ حال کو مرزا حیدر شکوہ بہادر و مرزا نورالدین حیدر بہادر شیعی مذہب نے ایک علَم کمال تجمّل سے عمائدینِ شہر کے جلوس کے ساتھ حضرتِ عباسؓ کی درگاہ پر چڑھایا اور سید محمد مجتہد العصر نے اپنے ہاتھ سے علَم نصب کیا اور مرزا نورالدین نے منبر پر بیٹھ کر ایک اردو کا مرثیہ، جس میں صحابہ کی بے ادبی تھی، مجمعِ کثیر میں باآوازِ بلند پڑھا اور مرثیے کے مقطع میں حضور (بادشاہ) کا تخلص درج تھا۔"[10]

دستورالعملِ اودھ[11] سے پتا چلتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے اس اقدام کو انگریزوں نے اور خود تیموریہ شہزادوں نے بھی پسند نہیں کیا۔ چناں چہ 'دہلی اردو اخبار' لکھتا ہے:

> "ہر چند علَم مبارک کے بنانے پر اکثر آلِ تیمور مغفور مانع بھی آئے اور جب تیار ہو چکا تو بھیجنے پر لکھنؤ کے بھی مانع رہے مگر حضور نے کسی کی بھی نہ سنی اور جو ذہنِ مبارک میں آیا، وہی کیا۔ بعض لوگ اس بات سے بہت رنجیدہ ہوئے کہ حضورِ والا سے ان کے برخلاف یہ امرِ جلیل ہوا ہے۔"[12]

آلِ تیمور کی مخالفت تو برداشت کی جا سکتی تھی لیکن مصیبت یہ آئی کہ انگریزوں نے بھی بہادر شاہ کے شیعی مذہب اختیار کرنے کی مخالفت کی۔ وہ دراصل اسے ایک سیاسی اقدام سمجھتے تھے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ ان کی تمام درخواستوں اور کوششوں کے باوجود انگریزوں نے جون ۱۸۵۲ء میں مرزا فخرو کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ اس پر بہادر شاہ انگریزوں سے بددل ہو گئے۔ اس واقعے کے کچھ ہی دن بعد ظفر کے شیعی مذہب اختیار کرنے کا واقعہ پیش آیا۔ اس پر انگریزوں کو غالباً یہ خیال گزرا کہ ظفر اس طرح سیاسی اعتبار سے اودھ اور

ایران کے قریب آنا اور ان سے مدد لینا چاہتے ہیں۔[۱۳]

'اس سلسلے میں سب سے اہم بیان حکیم احسن اللہ خاں کا ہے جو اُنھوں نے عدالت میں بہادر شاہ ظفر پر مقدمے کے دوران بطور گواہ دیا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنا بیان شروع ہی اس واقعے سے کیا تھا۔ اُنھوں نے کہا:

''لارڈ ایلن برو کے عہد میں جس وقت سے گورنر جنرل کا بادشاہ کو نذر دینا بند ہوا ہے بادشاہ ہر وقت اُداس رہا کرتے تھے۔ اولاً تو اُنھوں نے اس معاملے کے لیے ولایت میں تحریک کی اور بعد میں ہمیشہ اس حکم کے شاکی رہے۔ اس کے سبب اپنی بددلی ظاہر کرتے رہے۔ بعد میں جب گورنمنٹ نے ان کی یہ خواہش، کہ ان کا چھوٹا بیٹا جواں بخت باوجودیکہ یہ طے پاچکا تھا، کہ، سب سے بڑا لڑکا مرزا فتح الملک اُن کے بعد گدّی نشین ہوگا، ولی عہد، بنا دیا جائے، پوری نہ کی تو ان کو اور بھی زیادہ رنج ہوا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد مرزا حیدر پسر خان بخش پسر مرزا سلیمان شکوہ مع اپنے بھائی مرزا مراد کے، لکھنؤ سے دہلی آئے۔ وہ بیشتر بادشاہ سے ملاقات کیا کرتے تھے...... یہ شہزادے بادشاہ کی مہر ثبت کر کے چند کاغذات اپنے ہمراہ لے گئے...... لکھنؤ جا کر مرزا حیدر نے ایک عَلَم تو بادشاہ کی طرف سے شاہ عباس کے مقبرے پر چڑھایا اور ایک پنسلی نوٹ جس پر بادشاہ کی مہر ثبت تھی اور جس کا مضمون یہ تھا کہ میں سنّی فرقے کو ہند میں شیعہ کرنا اور خود شیعہ ہونا چاہتا ہوں، مجتہد کو دیا۔ یہ خبر چند اور شاہزادوں کے خطوط سے جو سنّی تھے اور چند سنّیوں کی درخواست سے معلوم ہوا'' ...... جب یہ خبر شہر میں مشہور ہوئی تو خاص خاص علما بادشاہ کے پاس گئے اور اس کی اصلیت دریافت کرنی چاہی۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ مرزا حیدر نے بہت سے لکھے ہوئے کاغذوں پر میری مہر ثبت کی تھی اور ان کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گیا تھا اور ایک شقہ میں نے مجتہد کو بھی لکھا تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے اہلِ بیت سے محبت ہے اور جس کو ان سے اُنس نہ ہو، وہ مسلمان نہیں ہے۔ بعد میں بادشاہ کی درخواست پر ایجنٹ لیفٹیننٹ گورنر نے اس شقہ کی ایک نقل مجتہد سے منگا دی اس کا مضمون بالکل وہی تھا جو درخواستوں سے معلوم ہوا تھا۔''

یہ یقینی امر ہے کہ بادشاہ نے شاہِ اودھ کو بھی جو شیعہ تھا کوئی تحریر بھیجی تھی...... ایک ہی سال بعد مرزا نجف کے ایران جانے کی خبر اُڑی۔ مرزا نجف مرزا حیدر کے بھائی ہیں اور بادشاہِ دہلی کے بھتیجے۔ یہ خبر مولوی باقر کے اخبار میں چھپی تھی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ شاہِ ایران نے ان کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ میں نے مرزا نجف کے بڑے دوست مرزا علی بخت سے دریافت کیا تھا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے کوئی خط شاہِ ایران کے نام لے گئے ہیں۔ اُنھوں نے خط کا اِقرار کیا اور کہا۔ اس میں بادشاہ نے یہ لکھوایا کہ میں شیعہ ہوگیا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میری حالت اس وقت بہت زبوں ہے مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا...... چوں کہ مرزا حیدر نے بادشاہ کے مذہب کی تبدیلی کرائی تھی، اس لیے یہ کل معاملات سنّیوں سے (جن میں ایک میں بھی ہوں) چھپائے گئے تھے مگر یہ خبریں مجھے اور لوگوں سے معلوم ہوئیں۔''

غالباً انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس خبر کی تردید کریں کہ اُنھوں نے شیعہ مذہب اختیار کرلیا ہے اور خود بھی اس معاملے کی تحقیق شروع کردی۔ چناں چہ ظفر نے ایک اعلامیہ تردید میں شائع کیا، جس میں کہا گیا کہ اُن پر جو ترکِ مذہبِ اہلِ سنّت اور اختیارِ شیعیت کی تہمت لگائی جارہی ہے اس کی بنیاد محض کذب و دروغ گوئی پر ہے۔ بادشاہ کی طرف سے جو شقہ جاری کیا گیا اس میں کہا گیا:

''آن...... اخبارِ دروغ، دروغ آرایانِ ناہنجار ضلالت شعار کہ تہمتِ ترکِ مذہبِ اہلِ سنت و اختیارِ شیعیت نسبت بحضور بستہ صدورِ بعض امورِ منافیِ آیینِ دینِ اسلام را کہ خبرِ گمرہی دادند...... ایں ہمہ افتراہاے دروغِ مرزا حیدر شکوہ و مرزا نورالدین است کہ محض ازراہِ حسد براے بدنام ساختنِ حضور کردہ اند......'' ۱۵

دہلی کے ایجنٹ سائمن فریزر نے اودھ کے ایجنٹ کے نام خط میں لکھا ہے:

''مرزا سلیماں شکوہ بہادر کے پوتوں نے...... ایک قطعۂ شقہ مہری خاص موسومہ مجتہد مذکور بنایا، جس میں ترکِ مذہب اہل سنّت والجماعت اور مذہب شیعہ کا اختیار کرنا اور امام باڑے کی تعمیر اور ہمیشہ کو تعزیہ داری

اختیار کرنا لکھا تھا۔ بندگانِ والا کو رافضی مذہب قبول کرنے سے بدنام اور متہم کیا۔ یہ سب غلط و بے اصل اور افترا و بہتان ہے۔" ۱۶؎

اگر چہ ظفر نے اپنے شیعی ہونے کی خبر کی تردید پُر زور الفاظ میں کی لیکن واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کا رجحان واقعی شیعی مذہب کی طرف ہو گیا تھا۔ اگر چہ بعد کو انھیں انگریزوں کے دباؤ سے اس کی تردید کرنا پڑی ورنہ مذہب کا معاملہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ کوئی اخبار کسی معمولی سے آدمی کے بارے میں بھی اس قسم کی غلط خبر نہیں دے سکتا اور یہاں تو بادشاہِ وقت کا معاملہ تھا۔ دہلی اردو اخبار نے ستمبر ۱۸۵۳ء اور اکتوبر ۱۸۵۳ء میں بادشاہ کے شیعی ہو جانے اور ایک مجلس تک میں شریک ہونے کی خبر چھاپی تھی۔ بظاہر یہ خبر غلط نہیں تھی ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اسی وقت خود بادشاہ اور تیموری شہزادے اس کی تردید نہ کرتے۔ اس وقت تک علَم لکھنؤ میں درگاہ عباس پر چڑھایا نہیں گیا تھا۔ تردید کافی عرصے بعد یعنی علَم کے چڑھانے کے بعد کی گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ بہادر شاہ پر اس سلسلے میں کوئی غیر معمولی دباؤ ڈالا گیا تھا۔ بہادر شاہ نے صرف تردیدی اعلان ہی جاری نہیں کیا بلکہ ایک فارسی مثنوی بھی اسی مضمون کی شائع کی۔ چوں کہ انگریزوں کو ڈر تھا کہ کہیں اودھ اور دہلی متحد نہ ہو جائیں، اس لیے اس مثنوی میں خاص طور پر ایسی باتیں کہی گئیں، جن سے ظفر اور واجد علی شاہ کے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو۔ دستور العملِ اودھ میں مشمولہ ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ اگر چہ یہ مثنوی بہادر شاہ ظفر کی طرف سے شائع کی گئی تھی مگر اس کے اصلی مصنف غالب تھے اور اس زمانے میں یہ بات عام طور پر مشہور تھی۔

اس مثنوی کے بارے میں کچھ اور کہنے سے پہلے ضروری ہے کہ غالب اور شاہانِ اودھ کے تعلقات پر مختصر سی روشنی ڈالی جائے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے غالب کی نظر دربارِ اودھ پر لگی ہوئی تھی۔ اگست ۱۸۲۶ء میں وہ کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ٹھہرے۔ غالب کی خواہش تھی کہ وہ نائب السلطنت نواب معتمد الدولہ کی خدمت میں حاضر ہوں لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۷؎

غالب کو نواب غازی الدین حیدر کے دربار سے کبھی کچھ نہیں ملا۔ جب نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے تو ان کی شادی کی تقریب پر غالب نے ایک قطعۂ تہنیت کہہ کر بھیجا۔ کچھ عرصے بعد نصیر الدین حیدر کی مدح میں ایک اور قصیدہ لکھا جو اُن تک نہ پہنچ سکا۔ شاہانِ اودھ سے غالب کے تعلقات کی مختصر داستان قاضی عبدالودود کی زبانی ملاحظہ ہوں:

"غالب کے ایک خاص شاگرد میکش کی رسائی لکھنؤ میں قطب الدولہ کے یہاں ہو گئی۔ غالب کو

اس کا اِمکان نظر آیا کہ قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علی شاہ کی خدمت میں قصیدہ پیش کر کے صِلہ وصول کیا جائے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ کم از کم پانچ ہزار ملیں، چوں کہ خود صِلے کی رقم مقرر کر دینا دستور نہیں، اُنھوں نے یہ دکھانا چاہا کہ یہ دربارِ اودھ کا معمول ہے کہ مجھے قصیدے کا صلہ اس قدر ملے، نصیر الدین حیدر کی مدح کے قصیدے کی نسبت قطب الدولہ کو لکھتے ہیں:

''از عہدِ اورنگ نشینی نصیر الدین حیدر...... بہ صیغۂ صلہ مدح زلہ خوار خوان عطائی آن سلطنتم۔ قصیدۂ من بوساطت روشن الدولہ بہ پیشگہِ سلطان...... گذشتہ و پنج ہزار روپیہ مرحمت گشتہ۔''

اس کے صراحتہً یہ معنی نکلتے ہیں کہ غالب نے صِلہ پایا، ورنہ ''زلہ خوارِ خوانِ عطا'' مہمل ہو جاتا ہے۔ صلہ یابی کی اُمید منقطع ہونے لگی تو غالب نے عالمِ یاس میں میکش کو لکھا کہ میری یہ قسمت کہاں کہ صلہ ملے۔ ''نصیر الدین حیدر مدح شنید و زر بخشید، روشن الدولہ و منشی محمد حسن پاک بخوردند و پشیزی بمن نرسید۔'' لیکن یہ بھی داستانِ محض ہے، نصیر الدین حیدر تک قصیدہ پہنچا ہی نہیں۔ اس صورت میں صلے کا کیا سوال ہے۔ کلیات کے ایک سے زیادہ قدیم نسخوں میں قصیدہ مذکور کا عنوان یہ ہے۔ ''...... نگارش پذیرفتن مدحِ شاہِ اودھ درجریدہ و بورق یادگار ماندن مدح بہ ممدوح نارسیدہ، از عالمِ مستی بیوی بادۂ ناکشیدہ۔'' [۱۸]

اس داستان میں بعد کو غالب نے یہ اضافہ کیا کہ اس سلسلے میں ناسخ سے مراسلت ہوئی اور اُنھوں نے وعدہ کیا کہ روپے روشن الدولہ کے حلق سے نکال لیں گے مگر اُسے کیا کیجیے کہ اس کے بعد ہی نصیر الدین حیدر فوت ہو گئے۔ غالب یہ بھی فراموش کر گئے کہ عہدِ روشن الدولہ میں ناسخ کا وہ اثر نہ تھا کہ ایسا وعدہ کر سکتے...... امجد علی شاہ کی مدح کے قصیدے کے متعلق غالب نے قطب الدولہ کو لکھا تھا کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ پانچ ہزار صلہ اور اسی قدر بطور زادِ راہ غالب کو بھیجا جائے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس پر عمل ہو، وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ روپیہ نہ پایا، اسی لیے نہ لکھا کہ امجد علی شاہ واجد علی شاہ کے باپ تھے اور ان کی موت کو زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا، غالب سمجھے ہوں گے کہ اگر تحقیق ہوئی تو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس قصیدے کے بارے میں غالب نے ایک اور خط میں لکھا ہے کہ متوسط نے نوید دی کہ قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا مگر پھر خاموش ہو گیا۔ بعد کو خبر ملی کہ اس کی رسائی بادشاہ تک ہوئی ہی نہیں۔ اس سلسلے میں خط اسمی قطب الدولہ کی عبارتِ ذیل توجہ طلب ہے۔

'' نواب صاحب (قطب الدولہ بآئینی شایستہ (قصیدہ را) بنظر گہہ

خاقان (واجد علی شاہ)...... گذرانند و حال ثنا گستری و سخن وری من و نوازش و بخشش فردوس منزل (نصیرالدین حیدر) بعرضِ خسرو سپہر بارگاہ رسانند۔ اگر بخت نارسائی کند و عطیہ بقدر جاہ و دستگاہ شاہ نباشد، باری ہم بدان مایہ بخشش کہ از عہدِ فردوس منزل معمول است، قناعت میتوانم کرد۔" [19]

واجد علی شاہ سے غالبؔ کو کچھ امید باقی تھی لیکن جب یہ مشہور ہوگیا کہ اس مثنوی کے اصلی مصنف غالب ہیں تو یہ امید بھی ختم ہوگئی۔ خوش نصیبی سے غالب کو ایک اور موقع مل گیا۔ وہ یہ کہ کہا جاتا ہے، واجد علی شاہ کو خواب میں جناب سیّدالشہدا کی طرف سے بشارت ہوئی کہ ہم خاکِ شفا تمھارے لیے بھیجتے ہیں۔ خاکِ شفا کی ضریح بڑے تزک و احتشام سے لکھنؤ منگائی گئی۔ اس موقع پر غالب نے ایک قصیدہ کہہ کر مجتہد العصر سلطان العلما سید محمد صاحب کو بھیجا، اس کا مطلع ہے:

بیا در کربلا، تا آن ستم کش کارواں بینی

کہ در وَے آدمِ آلِ عبارا ساربان بینی

سلطان العلما نے یہ قصیدہ اپنے سفارشی خط [20] کے ساتھ واجد علی شاہ کے سامنے پیش کیا۔ اسی خط سے پتہ چلتا ہے کہ اس مثنوی کے مصنف غالبؔ تھے اور واجد علی شاہ کو یہ بات معلوم تھی۔ سید محمد کا خط ملاحظہ ہو:

"چوں کہ اعلیٰ حضرت کے لیے ضریحِ مبارک خاکِ شفا کے پہنچنے کی خوش خبریِ اس دارالسلطنت سے شاہ جہاں آباد کو پہنچی، اس لیے اسداللہ خاں غالب نے جو بے مثل شاعر ہے، ایک قصیدہ مدحِ ضریح میں لکھ کر اور اعلیٰ حضرت کی ثنا گستری بھی کر کے بطریقِ ہدیۂ محقرہ کے جو بعد قبول کے تحفۂ موقرہ ہو جائے گا۔ حضورِ معلیٰ میں پیش کیا۔ اس لیے خاکسار نے کہ ہمیشہ نیک کاموں میں سعی کرتا ہے، دربار میں اس کو روانہ کیا۔ گر قبول افتد، زہے عزّ و شرف۔ چوں کہ اس میں مرثیہ اور رلانے والے اشعار بھی پائے جاتے ہیں، ظنِ غالب ہے کہ بمجوائے اس فقرۂ شریفہ کے کہ حدیث بکا و بکا کی میں وارد ہوا ہے (یعنی خدا اس کے گناہ کو گو وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں معاف کر دے گا) پہلی مثنوی میں اس سے جو لغزش ہوگئی ہے، وہ معاف ہو جائے گی۔ امید ہے کہ مدح گو ہمیشہ موردِ مراحم سلطانیہ رہے گا۔" [21]

اس کے کچھ دن بعد سلطان العلما نے غالبؔ کو لکھا:

''آپ کے خط کے جواب میں ایک معروضہ لکھ چکا ہوں، جس میں یہ اطلاع دی ہے کہ ایک معروضہ مع قصیدے کے بادشاہ سلامت کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ یقین ہے کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ مگر اب تک اس کا جواب نہیں آیا۔ اس وقت قابلِ اظہار بات یہ ہے کہ قصیدہ حضور کو بہت پسند آیا اور خلعتِ فاخرہ کے عطا کرنے کا حکم صادر ہوا۔ لیکن اس خیال سے کہ آپ چوں کہ خاندانِ صاحب قرانی سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ایسا نہ ہو کہ اس عطیے کا بھیجنا مخالفِ مزاج اُس بادشاہ کے ہو، اس معاملے میں توقف کیا گیا۔ اب جو آپ کی رائے ہو اس پر عمل کیا جائے۔'' ۲۲

'یادگارِ غالب' میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کی شیعیت کا ذکر کیا ہے اور پھر اُس مثنوی کی تفصیل بھی بیان کی ہے جو غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے نام سے لکھی تھی۔ حالیؔ لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ بہادر شاہ بہت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے مہمان تھے۔ اُن کا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا تو مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاکِ شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے گی تو حضرت عباسؓ کی درگاہ میں علَم چڑھاؤں گا۔ چناں چہ اُنھوں نے لکھنؤ جا کر بادشاہ کو عرض داشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے، حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور اُنھوں نے بڑی دھوم دھام سے علَم چڑھایا، جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علَم چڑھوایا گیا۔ اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللہ خان مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب (غالبؔ) نے

بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام غالباً 'دمغ الباطل' رکھا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔''۲۴

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے لکھا ہے کہ:

خواجہ حالی کے اس بیان میں کئی غلطیاں ہیں، جن میں دو بہت نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ اُنھوں نے مرزا حیدر شکوہ کو مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا اور اکبر شاہ کا بھتیجا بتایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا حیدر شکوہ مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے نہیں تھے بلکہ ان کے بیٹے مرزا کام بخش کے بیٹے تھے یعنی مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے اور اکبر شاہ مرزا سلیمان شکوہ کے بڑے بھائی تھے، اس لیے مرزا حیدر شکوہ اکبر شاہ کے بھتیجے نہیں بلکہ پوتے ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ کے بیٹے تھے، اس لیے وہ مرزا حیدر شکوہ کے چچا ہوئے۔ مرزا حیدر شکوہ اپنی مثنوی 'شوکتِ حیدری' میں خود کہتے ہیں:

جناب بہادر شہ نامدار

کہ ہم عم ماہست و ہم شہر یار

دوسری غلطی یہ ہے کہ 'دمغ الباطل' مرزا غالب کی مثنوی کا نام قرار دیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ غالب کی مثنوی کا نہیں بلکہ شیخ امام بخش صہبائی کی مثنوی کا نام تھا، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ غالب کی زیر بحث مثنوی کا غالباً کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا۔

علَم کے قضیے کے متعلق خود مرزا حیدر شکوہ کا بیان یہ ہے کہ جس زمانے میں وہ کلکتے میں مقیم تھے، بہادر شاہ ظفر بیمار ہوئے۔ اسی بیماری کی حالت میں اُنھوں نے ایک خواب میں خود کو حضرت عباس کی درگاہ میں علَم چڑھاتے ہوئے دیکھا اور ایک خط میں مرزا حیدر شکوہ کو اس خواب کا حال لکھ بھیجا۔ جب بہادر شاہ کو صحت ہوئی تو اُنھوں نے ایک سونے کا علَم بنوا کر مرزا حیدر شکوہ کے بھائی مرزا انور الدین کے ہاتھ لکھنؤ بھیجا۔ جب حیدر شکوہ کلکتے سے واپس آئے اور بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنھوں نے اس خواب اور علَم کا حال زبانی بھی ان سے بیان کیا اور لکھنؤ کے مجتہد سلطان العلما مولوی سید محمد صاحب کے نام ایک خط لکھ کر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت روانہ کیا۔ انھیں کے ہاتھ ایک خط مرزا انور الدین کو بھی بھیجا، جس میں اُن کو لکھا کہ معلوم نہیں علَم حضرت

عباسؓ کی درگاہ میں چڑھا دیا گیا یا نہیں۔ نہ چڑھایا گیا ہو تو جلد چڑھا دیا جائے۔ قصہ مختصر مرزا حیدر شکوہ کی معرفت بہادر شاہ کا خط وصول ہونے کے بعد مجتہد العصر نے ۲ ربیع الاوّل سنہ ۱۲۷۰ھ کو وہ علَم شاہی انتظام اور شاہانہ جلوس کے ساتھ حضرت عباسؓ کی درگاہ میں چڑھا دیا۔ یہ خبر کچھ جھوٹے سچے حاشیوں کے ساتھ دہلی پہنچی اور وہاں کے علما و مشائخ نے بہادر شاہ کو دھمکی دی کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو جمعے اور عیدین کی نمازوں کے خطبے سے ان کا نام نکال دیا جائے گا۔ اس خوف سے بہادر شاہ مُکر گئے اور یہ ظاہر کیا کہ مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نور الدین نے ان کی بیماری کے زمانے میں ان کی صحت کے لیے اپنے مذہب کے موافق علَم چڑھانے کی نذر مانی تھی، جس کو اُنھوں نے اپنے طور پر پورا کیا ہے۔

علَم کے قضیے نے بہت طول کھینچا اور اس کے بارے میں بہت خط و کتابت ہوئی۔ اس سلسلے کی تمام اہم تحریریں مرزا حیدر شکوہ نے ایک رسالے میں جمع کر دی ہیں۔ اسی رسالے میں اُنھوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کل مغل بادشاہ مذہباً شیعہ تھے اور دعوے کے کچھ ثبوت بھی پیش کیے ہیں۔ یہ رسالہ سنہ ۱۲۷۰ھ میں 'رسالۂ علَم حیدری در عقائدِ سلاطینِ تیموری' کے نام سے لکھنؤ میں چھپا تھا اور اس کا ایک نسخہ راقم کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔'' [۲۴]

سید مسعود حسن رضوی نے اس مثنوی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے، ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔ جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازمِ شاہی ہوں۔ جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خان کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔''

یہ مثنوی بہادر شاہ کی طرف سے لکھی گئی تھی مگر خواجہ حالی کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو غالب نے نظم کیا تھا اور خود اس کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو لوگوں نے کلام کی شان سے اندازہ کر لیا کہ یہ غالب کے قلم سے نکلی ہے۔ چناں چہ اس مثنوی کے جواب میں جو مثنوی کہی گئی، اس کے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

خصم گردد ز قہر او منکوب (کذا)
گرچہ غالب بود، شوَد مغلوب

مجتہد العصر سلطان العلما مولوی سید محمد صاحب کے بھتیجے زبدۃ العلما مولوی سید علی نقی صاحب کی قلمی کشکول، جو میرے حکیم سید علی صاحب آشفتہ کے پاس موجود ہے، اس میں غالبؔ کی یہ مثنوی بھی نقل کی گئی ہے اور اس کے عنوان پر 'مثنوی مرزا نوشہ غالب' لکھا ہوا ہے۔ اس کشکول میں وہ تحریریں بھی نقل کی گئی ہیں جو رسالہ 'علم حیدری' میں شامل ہیں اور ان کے علاوہ اس سلسلے کی چند تحریریں اور بھی اس میں موجود ہیں۔

غالبؔ کی مثنوی کے جواب میں جو مثنوی لکھنؤ میں کہی گئی تھی وہ 'مثنوی شیعیان علی در رد مثنوی جعلی دہلی' کے نام سے سنہ ۱۲۷۰ھ میں چھپی تھی۔ اس کے ساتھ غالبؔ کی مثنوی بھی شامل ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس جوابی مثنوی میں مصنف کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خواجہ آتشؔ کے شاگرد میر دوست علی خلیلؔ کی تصنیف ہے۔ جب یہ مثنوی دہلی پہنچی تو یہ خبر بھی پہنچ گئی کہ اس کا مصنف کون ہے؟ اس مثنوی کے جواب میں شیخ امام بخش صہبائی نے 'دمغ الباطل' کے نام سے ایک مثنوی کہی، جو ۱۲۷۱ھ میں افضل المطابع دہلی میں چھاپی گئی۔ اس مثنوی میں لکھنؤ والی مثنوی کے مصنف میر دوست علی خلیلؔ ہی قرار دیے گئے ہیں۔ مثنوی کے ابتدائی حصے میں صہبائی نے ان کے نام کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

روے آں کرد مرتدِ ازلی

دشمن است آنکہ نیست دوست علی

اور آخری حصے میں ایک جگہ نام اور تخلص دونوں لائے ہیں:

دشمن از کلام تسبت

بغلط گشتۂ نو دوست علی

اے بد انجام زشت آبائی

باز آ زین کلام آرائی

ورنہ چندان ذلیل خواہی شد

کہ بگیران خلیل خواہی شد

اور اسی سلسلے میں کنایۃً یہ بھی کہا ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف میں مفتی میر محمد عباس صاحب شوستری

نے خلیؔل کو مدد دی ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کا رنگ کالا تھا، اس لیے صہبائی نے ان کو لفظ 'سیاہ' سے یاد کیا ہے۔ کہتے ہیں:

پند من بشنو و بہانہ مگیر

بگذر از صحبت سیاہ شریر

این سیاحت تباہ خواہد کرد

دل چو رویت سیاہ خواہد کرد

مفتی صاحب کا قیام ان دنوں کلکتے میں تھا جب 'دمغ الباطل' ان کی نظر سے گزری تو شریف العلما مولوی حاجی سید شریف حسین ابن ارسطو جاہ مولوی حاجی سید رجب علی خان کی فرمائش پر انھوں نے اس کے جواب میں مثنوی 'خطابِ فاصل' لکھی جو سنہ ۱۲۷۶ھ میں شروع اور سنہ ۱۲۷۷ھ میں ختم ہوئی، اس مثنوی کا ایک نسخہ جس کے ساتھ صہبائی کی 'دمغ الباطل' بھی شامل ہے۔ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ نسخہ مطبع مجمع البحرین لدھیانہ میں سنہ ۱۲۸۶ھ میں چھپا تھا۔ ذیل میں مثنوی 'خطابِ فاصل' کے ابتدائی حصے سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں، جن سے اس مثنوی کا سبب تصنیف معلوم ہوتا ہے:

این زمان کان ز ہجرت نبویست

شش و ہفتاد و یک ہزار و دویست

ورقے چند چہر آمد

ظلمتِ کفر در نظر آمد

نظم مربوط بود و بندش نغز

لیک مانند نے ہمہ بے مغز

غالباً از کلامِ غالبؔ بود

کہ سوے شاہ نسبتش بہ نمود

پس خلیل جلیل دوست علی
عاشق صادق علی ولی
از سواد عیون حور بہشت
رد بر آن نامۂ سیاہ نوشت
حالیا دیگرے زقوم ذلیل
رد نوشتست بر کلامِ خلیل
ہیچ از ننگ و نام بخشش نیست
جز بہ نام از امام بخشش نیست
من ندارم باو شناسائی
چیست صہبا و کیست صہبائی
بر خلیل جلیل برد گمان
کہ بہ نیروی من کشیدہ کمان
لا جرم برمنش عتابے ہست
طعن وطنزے وپیچ وتابے ہست
طعنہ برمابجای خود زدہ است
خود درفشے بپای خود زدہ است
رد او را چو بندہ بنویسم
عیب او پوست کندہ بنویسم
دیدۂ گر تو دمغ باطل را
بنگر ہم خطاب فاصل را

این منم در حدود کلکتہ

ہست معلوم حالش البتہ

نیست ایں جا مآخذ و نہ مواد

می نویسم جواب او برباد

اس سلسلۂ مثنویات کی پہلی کڑی جو غالبؔ کی طرف منسوب ہے، کے جواب میں ایک مثنوی شاہزادۂ مرزا حیدر شکوہ نے بھی کہی تھی اور اس کا نام اپنے نام کی رعایت سے 'شوکت حیدری' رکھا تھا۔ یہ مثنوی رسالۂ علم حیدری کے ساتھ بھی چھپی تھی اور علاحدہ بھی۔ اس کا ایک نسخہ سنہ ۱۲۷۰ھ کا چھپا ہوا میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ غالبؔ کی زیرِ بحث بے نام مثنوی اس کتاب کے 'غالبؔ کی فارسی نظم ونثر' کے تحت نقل کی گئی ہے۔ اس مثنوی کے جواب میں جو مثنوی لکھی گئی تھی، اس کا کچھ ابتدائی حصہ بھی ضمیمے کے طور پر کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مذہبی مناظرہ شروع ہو گیا ہے اور اصل مثنوی میں جو سخت کلامی کی گئی تھی۔ اس کا جواب ترکی بترکی دیا گیا ہے۔

یہ پانچوں مثنویاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، فارسی زبان میں ہیں اور ان میں سے تین کے مصنف فارسی کے مشہور و معروف ادیب ہیں۔ صہبائیؔ فارسی کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ غالبؔ کی فارسی نثر و نظم کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بج رہا تھا، مفتی میر عباس ایک جید عالم اور فارسی و عربی کے زبردست ادیب اور شاعر تھے۔ ان کی علمیت و ادبیت کی شہرت ایران و عراق تک اور ان کی تصنیفوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ میر دوست علی خلیل اردو کے ممتاز شاعر تھے مگر ان کی یہ مثنوی بتاتی ہے کہ ان کی فارسی نظم بھی چست و درست ہوتی تھی۔ مرزا حیدر شکوہ کی عبارت میں بھی پختگی اور روانی کی صفتیں موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ پانچوں مثنویاں ادبی حیثیت سے اچھی خاصی دل چسپی کی حامل ہیں۔ مگر چوں کہ اس سلسلے کی پہلی مثنوی کا لہجہ تند تھا، اس لیے ہر جوابی مثنوی کا لہجہ تندتر ہوتا گیا اور چوں کہ ان میں دو فریقوں کے مذہبی نزاعی مسئلے زیرِ بحث تھے، اس لیے کلام میں تلخی بڑھتی گئی۔

زبدۃ العلما مولوی سید علی نقی کی جس کشکول کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس میں غالبؔ کا ایک سلام بھی ہے جو اُنھوں نے سلطان العلما مولوی سید محمد صاحب کو سنہ ۱۲۷۰ھ میں بھیجا تھا۔ یہ سلام رسالہ 'مبصر' لکھنؤ کے مئی سنہ ۱۹۲۹ء کے پرچے میں شائع ہوا تھا اور اسی پرچے سے اس کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔ اس سلام کا ایک شعر جس میں ایک نزاعی مذہبی مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا تھا حذف

کر دیا گیا ہے۔ ۲۵ؔ

آخر میں غالبؔ کی مذہبی شخصیت کے ایک دل چسپ پہلو کا ذکر ضروری ہے۔ غالبؔ موقعے کے اعتبار سے کبھی شیعہ ہو جاتے ہیں کبھی سنّی۔ بقول قاضی عبدالودود:

''ایک نہیں بیس جگہ (غالبؔ نے) اپنے آپ کو اثنا عشری لکھا ہے۔'' ۲۶ؔ

''یادگارِ حالی' میں مولانا الطاف حسین حالیؔ نے لکھا ہے:

''ایک بار مرحوم بہادر شاہ ظفرؔ نے دربار میں یہ کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسداللہ غالبؔ شیعی المذہب ہے۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی۔ چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں، جن میں تشیّع اور رفض سے تحاشی کی تھی، ان میں سے ایک رباعی تو بہت لطیف ہے۔ مجھ کو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے۔''

مولانا حالی نے 'یادگارِ غالب' میں اس موقع کی ایک ہی رباعی دی ہے، جو انھیں یاد رہ گئی۔ حُسنِ اتفاق سے اس سلسلے کی باقی چار رباعیاں 'سراج الاخبار' کے جس شمارے میں شائع ہوئی تھیں، وہ شمارہ بھی دستیاب ہو گیا ہے۔

جن لوگوں کو ہے، مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری؟

اصحاب کو جو ناسزا کہتے ہیں
سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبی نے اون کو اپنا ہمدم
ہے ہے، نہ کہو، کسے بُرا کہتے ہیں

یارانِ رسول یعنی اصحابِ کبار
ہیں گرچہ بہت، خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار
غالب! وہ مسلمان نہیں ہے، زنہار!

یارانِ نبی میں تھی لڑائی کس میں؟
الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں؟
وہ صدق، وہ عدل ، وہ حیا، وہ علم
بتلاؤ کوئی کہ تھی برائی کس میں؟

یارانِ نبی سے رکھ تولا، باللہ!
ہر یک ہے کمالِ دیں میں یکتا، باللہ!
وہ دوست نبی کے اور تم اون کے دشمن
لاحول ولا قوۃ الا باللہ![27]

غالب نے حقیر کے نام ۲۳ رجنوری ۱۸۵۴ء کے ایک خط میں لکھا ہے:

"وہ مثنوی اور اعلام نامہ میں نے تمھارے پاس بھجوایا ہے۔ وجہ یہ کہ جب حضور نے حکم دیا کہ عمائد اہلِ تسنن جو اطراف و جوانب دہلی میں ہیں، ایک ایک نقل اُن کو بھیجی جائے۔ میں نے دفتر میں بہ قید علی گڑھ کول مفتی صدرالدین خاں صاحب کا، اور تمھارا نام لکھوادیا اور کالپی میں نواب انورالدولہ اور بریلی میں سیّد احمد کا نام لکھوادیا اور کوئی ایسا سنّی گراں مایہ میرے ہاتھ نہ آیا۔"

غالب کے خطوط: ۳: ۱۱۳۹

حواشی

ظفرؔ کی شیعیت اور غالبؔ

۱- سرسید احمد خاں، اسبابِ بغاوت ہند، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۸

2- P. SPEEARS,TWILIGHT OF THE MUGHALS, PP-74-75

۳- غالب کے خطوط: ۳: ۱۱۳۲

۴- دستور العمل اودھ بحوالۂ معارف، اپریل ۱۹۲۲، ص ۲۸۶

۵- دہلی اردو اخبار، ۴؍ستمبر ۱۸۵۳ء، بحوالہ سہ ماہی، نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۵۸ء، ص ص ۳۵۔۳۶

۶- مرزا نورالدین بہادر اور مرزا حیدر شکوہ، یہ دونوں سلیمان شکوہ کے پوتے تھے اور شیعی تھے۔

۷- دہلی اردو اخبار، ۹؍اکتوبر ۱۸۵۳ء، بحوالہ سہ ماہی نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۳۶
تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ذکرِ غالب، ص ص ۶۴۔۶۶

۸- دستور العمل اودھ (قلمی) بحوالۂ معارف، اپریل ۱۹۲۲ء، ص ۲۸۰۔ رضا لائبریری، رام پور میں دستور العمل اودھ کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے، جس میں بہادر شاہ ظفرؔ کی شیعیت کے سلسلے میں خود ظفر، مولانا سید محمد صاحب اور دوسرے لوگوں کے خطوں اور دوسری تحریروں کی نقلیں موجود ہیں۔ یہ تمام تحریریں حافظ احمد علی خاں نے اپریل اور مئی ۱۹۲۲ء کے معارف میں شائع کی تھیں۔ حافظ صاحب تمام فارسی تحریروں کا اردو ترجمہ بھی ساتھ دیا ہے۔

۹- دستور العمل اودھ (قلمی بحوالہ معارف، اپریل ۱۹۲۲، ص ۲۸۱

۱۰- دستور العمل، اودھ بحوالۂ معارف، اپریل ۱۹۲۲ء، ص ۲۸۲

۱۱- مالک رام صاحب کا خیال تھا کہ یہ کتاب جعلی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہادر شاہ ظفر کا شیعیت کی طرف رجحان ہو گیا تھا۔ سرکاری کاغذات اور 'دہلی اردو اخبار' سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔

۱۲- دہلی اردو اخبار، ۹؍اکتوبر ۱۸۵۳ء

۱۳- جب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ پر مقدمہ چلا تو مکند لال نے عدالت میں بیان

دیتے ہوئے کہا:

''بادشاہِ دہلی دو سال گزرے (یہ مدت چار سال ہونی چاہیے خ۔ا) جب برٹش گورنمنٹ سے بدظن ہو گئے تھے اور طے کر لیا تھا کہ وہ آئندہ انگریزوں کی بالکل خاطر اور عزت نہیں کریں گے۔ مرزا حیدر شکوہ اور مرزا مراد فرزندان مرزا جان بخش ابنِ مرزا سلیمان شکوہ لکھنؤ سے یہاں آئے تو شاہ حسن عسکری نے بادشاہِ دہلی کو بادشاہِ ایران کے پاس خط روانہ کرنے کی رائے دی تھی۔'' (بہادر شاہ کا مقدمہ)

۱۴- چراغِ دہلی، ص ص ۲۲۴۔۲۲۸

۱۵- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مالک رام، ذکرِ غالب، ص ص ۶۴۔۶۵

۱۶- بین الاقوامی غالب سمینار

۱۷- ملاحظہ ہو: ذکر ص ص ۶۴۔۶۵

۱۸- قاضی عبدالودود، بین الاقوامی سمینار، ص ص ۲۷۔۲۹

۱۹- بین الاقوامی سمینار، ص ص ۲۷۔۲۹

۲۰- غالبؔ نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ دربار اودھ سے ان کا تعلق سلطان العلما کے واسطے سے قائم ہوا تھا۔ وہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

> ''تم جانتے ہو کہ میں ۱۴ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوسِ خاص، شالی رومال، دوشالہ ایک بار پیشگاہِ حضرت سلطانِ عالم سے پا چکا ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دوبار کس کے ذریعے سے ملا ہے یعنی جناب قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر مدّ ظلہٗ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ میں بے اون کے توسط کے مدح گستری کا قصد کروں۔ (غالب کے خطوط ۳:۷۷۵)

۲۱- دستور العملِ اودھ، بحوالۂ معارف (مئی ۱۹۲۲ء) ص ص ۳۶۵۔۳۶۶

۲۲- دستور العملِ اودھ

۲۳- یادگارِ غالب، ص ۷۷۔۷۸

۲۴- سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، متفرقاتِ غالبؔ

۲۵- متفرقاتِ غالب، ص ص ۲۲۔۳۱

۲۶- کچھ غالبؔ کے بارے میں، حصہ اوّل، ص ص ۵۸/۱، ۵۹/۲

۲۷- سراج الاخبار: ۸: ۲۸ (۱۲ر نومبر ۱۸۵۰ء)

بحوالہ عرشی زادہ ضمیمہ نسخۂ عرشی، نقوش، نومبر ۱۹۶۴ء

غالبؔ اور تیموری شہزادے

قلعے سے غالبؔ کا تعلق اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں ہوا تھا۔ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں غالبؔ کا قصیدہ ان کے کلیاتِ فارسی میں موجود ہے جس میں شہزادہ سلیم کی بھی تعریف کی گئی ہے جو ولی عہدی میں ظفرؔ کے حریف تھے۔ بہادر شاہ ظفر سے ولی عہدی کے زمانے میں غالب کے تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ کیوں کہ ذوقؔ کی موجودگی میں ان کی کامیابی ممکن نہیں تھی۔ ظفرؔ کے تخت نشین ہونے کے بعد غالبؔ کی حیثیت محض ایک شاعر سے زیادہ نہیں تھی۔ اُنھوں نے کبھی کسی شہزادے کی وفات پر مرثیہ لکھا، کبھی کسی کی مدح میں شعر کہے اور کبھی کسی کی ولادت پر ظفرؔ کو مبارک باد دی۔

مرزا شاہ رُخ

یہ ظفرؔ کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کا انتقال ۹ر اپریل اور ۲۳ر اپریل ۱۸۴۷ء کے درمیان کسی روز ہوا تھا غالب نے ان کی مدح میں یہ رباعی کہی تھی:

اے آنکہ بدہر نامِ تو شاہرخ است

پیوستہ تر بحضرتِ شاہ، رخ است

ناز و بتوشہ کہ باشد اندر شطرنج

امیدِ ظفر قوی چو بادشاہ رخ است

اس رباعی پر تبصرہ کر۔تے ہوئے قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:

''شاہرخ پسرِ بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ کے انتظامی امور میں خاصا دخل

تھا۔ غالبؔ کی رباعی جو دیوان کے ایک سے زائد مخطوطات اور 'باغِ دودر' میں بھی ہے، دیوانِ مطبوعہ سے خارج ہے۔''[1]

'باغِ دودر' میں مشرف الدولہ میر ولایت علی کے نام غالبؔ کا ایک خط ہے جس میں اُنھوں نے مرزا شاہ رخ کے بارے میں لکھا ہے:

''نفرینِ خدائے برمن کہ زمیں بوس شاہزادۂ ماہ لقا، و آن ہم بمیاں جگیریِ شمار آرزو کردم۔ و ہر چند کہ...... فروغِ گوہر...... من...... بدین فروگذاشت کہ از سوے پایہ ناشناسان بمیان آمد، از آنچہ بود نکاست، امّا ردائی کہ نہ بہنجار باشد، چگونہ منش را سزاوار باشد؟...... زین پیش دو بار بدان ہمایوں نشیمن رسیدہ ام۔ و ہر دو بار زود خواندہ اند و دیر نشاندہ اند۔ حاشا کہ دریں روش شاہزادہ طبعی باشد۔ ہمانا پیش از آنکہ من آیم قرار چناں بود کہ یک پاس در پاسبانانم نشانند و تا شاہزادہ را بلہوِ نظارۂ صندوقچہ مشغول نکنند، مرا پیش گاہ نخوانند، و چوں رو بروی رسم حضرت صاحب عالم اساسِ دل نوازی ننہند، و مرا بہ نشستن دستوری ندہند۔''[2]

رباعی اور اس خط سے پتا چلتا ہے کہ غالبؔ نے مرزا شاہ رخ سے تعلقات قائم کرنا چاہے تھے مگر نہ صرف یہ کہ آرزو پوری نہ ہوئی بلکہ شہزادے کا رویّہ ان کے ساتھ کچھ ایسا رہا کہ غالب اپنی اس آرزو پر نادم تھے۔ خط میں دو دفعہ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر ہے لیکن ان دونوں ملاقاتوں میں کچھ ایسی صحبت رہی کہ غالبؔ کے دل میں شہزادے کی طرف سے رنجش آ گئی۔ شہزادے کی موت کا ذکر کرتے ہوئے غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مردنِ شاہرخ را سبیلِ استبعاد و استعجاب نوشتن یعنی چہ؟ مگر بدانستِ شما مرگ را بر خسرواں و خسروزادگان دست نیست! دہلی، شاہرخ ہنگامِ باز گشتن از شکار چوں نزدیکِ میرت (میرٹھ) رسید، بتخمہ رنجور شد، و ہم در آں ناحیت مرد۔ جنازۂ او را بہ شہر (دہلی) آوردند و درکلاری باغ بائینِ مزارِ مادرش بخاکش سپردند۔''[3]

غالبؔ کے اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''شاہزادوں میں ان کی اہمیت، خط میں ان کی موت پر رسمی اظہارِ رنج بھی

نہیں، حال آنکہ یہ جوان اور سفر میں مرے تھے۔ اس کی وجہ کدورت ہی ہوسکتی ہے۔ رباعی (اے آنکہ بر ہر نام تو شاہرخ است) کا دیوانِ مطبوعہ سے اخراج، اس کا باعث بھی یہی ہے۔ بعد کو 'باغِ دودر' میں شمول اس وقت ہوا جب واقعہ کو بہت زمانہ گزر چکا تھا اور احساس میں شدّت نہیں رہی تھی۔'' ؎

مرزا فخرو

مرزا فخرو کا پورا نام مرزا فخرالدین فتح الملک بہادر المتخلص بہ رمزؔ تھا۔ مرزا فخرو کے نام سے مشہور تھے۔ یہ بہادر شاہ ظفرؔ کے صاحب زادے تھے۔ اُن کی شادی اپنے حقیقی چچا مرزا جہانگیر کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ مرزا فخرو کے صاحب زادے مرزا ابوبکر مرزا جہانگیر کی صاحب زادی کے بطن سے تھے۔ مرزا ابوبکر ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں مارے گئے تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں مرزا فخرو ولی عہد ہوئے۔ نواب ضیاالدین نیّرؔ رخشاں نے 'چراغِ دنیا' سے مادۂ تاریخ نکالا۔ یہ پہلے شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد اُنھوں نے غالبؔ کا تلمذ اختیار کرلیا۔ چالیس سال کی عمر پاکر ۱۰ر جولائی ۱۸۵۲ء کو ہیضے کے مرض میں مبتلا ہوکر خدا کو پیارے ہوگئے۔

لالہ سری رام نے 'خمخانۂ جاوید' کی تیسری جلد میں مرزا فخرو کے اشعار کا انتخاب شائع کیا ہے۔ ان میں چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

دل مرے سینے میں یہ کوئی ستم پیدا ہوا
جب سے دل پیدا ہوا ساتھ اُس کے غم پیدا ہوا

دل میں آتی ہے نظر اپنے مجھے تصویرِ یار
کیا تماشا ہے کہ کعبہ میں صنم پیدا ہوا

دیکھتے ہیں سارے عالم کا تماشا دل میں ہم
ساغرِ دل اپنا رشکِ جامِ جم پیدا ہوا

میں وہ مجنوں ہوں کہ جس کے باغِ جنت میں بھی رمزؔ

خارِ صحرائے جنوں زیرِ قدم پیدا ہوا

....

طرزِ رفتار نے تری ظالم
رفتہ رفتہ مجھے تمام کیا

میں جو رُسوائے زمانہ ہوگیا
اُس کی شہرت کا بہانہ ہوگیا

جا پڑے ہم کوچۂ جاناں میں رمز
بارے اپنا بھی ٹھکانہ ہوگیا

....

بَل کچھ ایسا کاکُل خمدار میں پیدا ہوا
پیچ و تاب اپنے دلِ بیمار میں پیدا ہوا

کٹ گئے دن رنج و غم کے بلکہ ساری عمر کے
کاٹ یہ اچھا تری تلوار میں پیدا ہوا

واہ وا کیا کیا ترے ہرگام پر محشر خرام
فتنہ تازہ اک تری رفتار میں پیدا ہوا

بل بے جوشِ گریہ اللہ رے وفورِ اشک و خوں
ایک طوفاں دیدۂ خونبار میں پیدا ہوا

....

اے دلِ بے تاب اتنا اضطراب
صبر تجھ پر اور تو میں کیا کہوں

کیوں نہ دوں زخم کو جگہ دل میں

کیا یہ قاتل کا یادگار نہیں

ہم کو کیا غیر کے آنے کی خبر

چغلیاں نقشِ قدم کھاتے ہیں

لب ہلے کیوں کہ تیری مجلس میں

دیکھ کر تجھ کو جان ہے کس میں

....

رمز وہ مستِ ناز ہے فتنہ

اس کو سونے دو کیوں جگاتے ہو

تم نہ تھے غیر کے گھر میں شب کو

بس چلو یوں ہی سہی جانے دو

مُنہ دکھانا ہے خدا کو اک دن

اے بُتو اتنی خودی جانے دو

ہر سخن میں یہ کجی جانے دو

ہوچکی بس خفگی جانے دو

رمز اُلفت میں جو چاہو آرام

تو یہ راحت طلبی جانے دو

....

ہم نے تو غمِ یار میں یوں عمر بسر کی

مرمر کے جو کی شام تو رو رو کے سحر کی

ایسا لگاؤ تیرِ نگہ تم، کہ ہو بلند

ہر زخمِ دل سے میرے صدا واہ واہ کی

....

نہ ہو جب ضعف سے طاقت کہ آئی جان ہے لب تک

تم ہم سے ناتوانوں کا کہو کس طرح دم نکلے[5]

جواں بخت

جواں بخت، زینت محل کے بطن سے بہادر شاہ ظفرؔ کے صاحب زادے تھے۔ ان کی شادی پر غالبؔ نے سہرا لکھا ہے، جس پر خاصے تنازعے ہوئے۔ اس تنازعے کا اس کتاب میں تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔ برطانوی حکومت نے جن لوگوں کو گرفتار کر کے رنگون بھیجا تھا، اُن میں بہادر شاہ کے علاوہ اُن کی بیوی زینت محل اور شہزادے جواں بخت بھی تھے۔ بقول اسلم پرویز ''اسیری کے زمانے میں جواں بخت کو دو سو روپے ماہوار پنشن ملتی تھی۔ اس کے علاوہ مکان اور ملازمین سرکار کی طرف سے مفت تھے۔

۱۶/جون ۱۸۶۶ء کو جواں بخت کو رِہا کر دیا گیا۔ بقول اسلم پرویز'' تین سو روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی گئی اور مکان کو آراستہ کرنے کے لیے پانچ سو روپے کی رقم بھی منظور کی گئی۔ جواں بخت نے اپنے پنشن میں اِضافے کے لیے گورنر جنرل کے نام پھر درخواست دی لیکن اس دفعہ درخواست پر غور نہیں کیا گیا۔

جواں بخت کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ جواں بخت نے لڑکی کی شادی کر دی تھی اور اس شادی پر اتنا روپیہ خرچ ہوا کہ جواں بخت خاصے مقروض ہو گئے۔ اُس زمانے میں جواں بخت نے جو قرض لیا تھا، اُس کی تفصیل، قرض خواہوں کی فہرست وغیرہ سب جواں بخت نے حکومت کو پیش کیا تھا۔ جواں بخت نے یہ درخواست بھی کی کہ اُنھیں اتنی رقم دی جائے کہ وہ قرض چُکا سکیں۔

ستمبر ۱۸۸۴ء میں جواں بخت کی طبیعت کچھ خراب ہوئی۔ آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے اُنھیں رنگون سے مولمین بھیج دیا گیا۔ مولمین میں رہتے ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اُن پر فالج کا حملہ ہوا۔ ۱۹/جون ۱۸۸۴ء کو رات کے دو بجے جواں بخت کو خون کی دو اُلٹیاں ہوئیں اور اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُسی رات کو مولمین میں ہی جواں بخت کی تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ کچھ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ

جواں بخت کا جنازہ رنگون لاکر بہادر شاہ ظفرؔ کے قریب ہی دفن کیا جائے لیکن حکومت نے یہ درخواست قبول نہیں کی۔[6]

مرزا خضر سلطان خضرؔ

مرزا خضر سلطان مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کے آٹھویں صاحب زادے تھے۔ یہی وہ خضر سلطان ہیں جن کی پیدائش پر غالبؔ نے یہ شعر کہا تھا:

خضر سلطان کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے دوران جب انھیں مغل پلٹن کا افسر مقرر کیا گیا تو ان کی عمر چھبیس سال تھی۔[7]

شاہی خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ انھیں بھی کپتان ہڈسن نے بہادر شاہ ظفرؔ کے ساتھ گرفتار کرلیا تھا۔

اس وقت خضر سلطان ہمایوں کے مقبرے میں روپوش تھے۔ان کے ساتھ گرفتار ہونے والوں میں بہادر شاہ ظفرؔ، خضر سلطان کے بڑے بھائی مرزا ظہیرالدین عرف مرزا مغل اور مرزا فخرو کے صاحب زادے یعنی خضر سلطان کے بھتیجے مرزا ابوبکر کو بھی گرفتار کرلیا تھا۔ ان تینوں شہزادوں کو، ہڈسن ایک چھکڑے میں بٹھا کر دہلی کے خونی دروازے پر لایا اور یہاں ان تینوں کو گولی سے اُڑا دیا۔[9] دوسرے دن دہلی والوں کو عبرت دلانے کے لیے تینوں شہزادوں کی لاشوں کو چاندنی چوک میں کوتوالی کے چبوترے کے پاس پھانسی پر لٹکا دیا جہاں یہ لاشیں کئی دن تک لٹکتی رہیں۔

مرزا خضر سلطان کی دو اولادیں تھیں۔ایک لڑکا مرزا محمد عثمان اور دوسری لڑکی۔لڑکی کی شادی مرزا خضر سلطان کے بھتیجے اور مرزا مغل کے صاحب زادے مرزا مجاہدالدین شاہی سے ہوئی تھی۔ شعر کہتے تھے اور افسرانؔ کا تخلص تھا:

گالی سے کون خوش ہو، مگر حسنِ اتفاق
جو تیری خُو تھی، وہ ہی مرا مدّعا ہوا

....

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر
غیروں پہ کرم ہو، یہ ستم بھی نہیں تھوڑا

....

جام جمشید کو، آئینہ سکندر کو ملا
خضر میں وہ ہوں، کہ حصّے میں مرے دل آیا

....

کہتے ہو: ''وہ بھی ہوس پیشہ ہے، جیسا تو ہے''
مجھ سے اک چھیڑ ہوئی، شکوہ عدو کا نہ ہوا
کہتے ہو کہ اک روز تجھے قتل کریں گے
پر یہ بھی تو اے شوخ ستم گر نہیں ہوتا

....

نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی، نہ سن سکتے ہیں کچھ تیری
ہمیں اس وقت میں اے بے وفا! دیکھا، تو کیا دیکھا

مرزا قادر بخش قادؔر سے اِصلاح لیتے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں یعنی ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء۔۱۸۸۹ء میں خدا کو پیارے ہوگئے۔

مرزا خدا بخش قیصر

'باغِ دودر' اور 'سبدِ چین' میں پانچ شعر کا ایک قطعہ ہے۔ اس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہیں:

وگر در سرتم کہ از روے مستی
شرابے بساتیِ کوثر فرستم
ہمانا بر آنم کہ اشعارِ خود را
بہ مرزا خدا بخش قیصر فرستم

صاحب گلستان سخن کا بیان ہے کہ یہ شاہ عالم کے نواسے، مرزا قادر بخش کے خالو اور مومن کے شاگرد تھے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں یہ بھی گرفتار ہوئے تھے اور جب ظفرؔ اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد رنگون کے لیے روانہ ہوئے تو یہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن الہ آباد پہنچ کر انھوں نے رنگون جانے سے انکار کر دیا۔ دہلی کے کمشنر سی۔ ایس۔ سانڈرس نے ان کے بارے میں گورنر جنرل کو لکھا:[۱۰]

"یہ (مرزا قیصر) بادشاہ کے چچا[۱۱] زاد بھائی ہیں، بالکل بے خرد۔ لیکن بہت دن تک بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہے ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ ان پر ذاتی نگرانی رکھی جائے۔ یا جب تک ہندوستان میں گڑبڑ ہے، ان پر کم از کم نگاہ رکھی جائے۔"

مرزا فرخندہ شاہ

یہ بہادر شاہ ظفرؔ کے غالباً ساتویں بیٹے تھے۔ ان کی وفات پر غالبؔ نے ۵۴ اشعار کا مرثیہ فارسی میں کہا تھا۔ مرثیے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کا انتقال کم عمری میں ہوا تھا۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شاخیکہ بود موسم آتش کہ بر دہد
از نخلِ عمرِ شاہ جدا کرد روزگار

شہزادہ خُرد سال و بود روزگار پیر

شوخی بشاہزادہ چرا کرد روزگار؟

زاں سبز خط کہ بر رخ اونادمیدہ ماند

گردی بدل نشست و غباری بدیدہ ماند

ترکیب بند کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

یا رب! جہاں ز فیضِ تو بابرگ و سازباد

عمرِ ابوظفر شہِ غازی دراز باد

حواشی

غالبؔ اور تیموری شہزادے

۱- جہانِ غالب: ماہنامہ شاعر، بمبئی (غالب نمبر ۱۹۶۹ء):۲۹

۲- جہانِ غالب، ماہنامہ شاعر، بمبئی: (غالب نمبر، ۱۹۶۹ء):۲۹

۳- باغِ دودر، ماہنامہ شاعر، بمبئی: (غالب نمبر ۱۹۶۹ء):۲۹

۴- باغِ دودر، ماہنامہ شاعر، بمبئی: (غالب نمبر ۱۹۶۹ء):۲۹

۵- خم خانۂ جاوید:۳:۴۹۷_۵۰۲

۶- بہادر شاہ ظفرؔ از اسلم پرویز:۱۸۷_۱۹۰

۷- تلامذۂ غالبؔ:۱۷

۸- سراج الاخبار، ۹، جلد سیزدہم۔۔۱۶ ر مئی ۱۸۵۷ء، بحوالہ عرشی زادہ، نقوش، نومبر ۱۹۶۴ء

۹- تینوں سے مراد ہے۔ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور اُن کے پوتے مرزا ابوبکر

Foreign Department 10 Dec.1858(S.No.82-125)

۱۰- Foreign Department.30 Dec.1857(86)

۱۱- مرزا قیصر بادشاہ کے چچازاد بھائی نہیں، پھوپھی زاد بھائی تھے۔

سکّے کا الزام

غالبؔ کو یقین تھا کہ وہ برطانوی حکومت کی نظر میں بے گناہ ثابت ہو چکے ہیں۔ اُنھوں نے ۱۲/ مارچ ۱۸۵۷ء کو مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا۔

''بہر حال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکّام کے نزدیک اتنا پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔''[۱۱]

غالبؔ نے جنگِ آزادی کے دوران ہر ممکن احتیاط سے کام لیا۔ چوں کہ ان دنوں میں کسی کو بھی یہ یقین نہیں تھا کہ فتح کس کی ہوگی، ہندوستانیوں کی یا انگریزوں کی، اس لیے غالبؔ کا رویّہ ایسا تھا کہ وہ ہندوستانیوں اور انگریز، دونوں سے بنا کر رکھتے تھے۔ جب ہندوستانیوں کو شکست ہوگئی اور دہلی پر برطانوی حکومت کا تسلّط قائم ہوگیا تو غالبؔ برطانوی حکومت کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے اور اپنی بریّت کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے لگے۔

چوں کہ غالبؔ خاصے عمر رسیدہ تھے اور اپنے عہد کے ممتاز ترین شاعر تھے، اس لیے اُن کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت کے سامنے وہ بے گناہ ثابت ہوں گے۔ اُنھوں نے اپنے کئی سر پرستوں، دوستوں اور شاگردوں کو جو خطوط لکھے ہیں، اُن میں بار بار اس کا اظہار کیا ہے کہ اُن کا بہادر شاہ ظفر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

غالبؔ کو یقین تھا کہ وہ انگریزوں کی نظر میں بے گناہ ہیں۔ اُنھوں نے ۱۲/ مارچ ۱۸۵۷ء کو ایک خط میں اپنے ایک شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہؔ کو جو کچھ لکھا تھا۔ تقریباً وہی بات غالبؔ نے تفتہؔ کے نام ۵/ دسمبر ۱۸۵۷ء کے خط میں دوہرائی ہے۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

''میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اِصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکّام کو معلوم ہے مگر چوں کہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی ،لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔''[۲]

غالبؔ مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے نام ۲۱ر جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''بھائی! میرا یہ حال ہے کہ دفترِ شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکّامِ وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، داروگیر سے محفوظ ہوں، کسی طرح کی باز پرس ہو، تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں، جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروے کار نہیں آیا، کسی حاکم کو نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا، کسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی۔''[۳]

غالبؔ سے حکومت نے کوئی باز پرس نہیں کی تھی اور نہ ہی غالبؔ نے حکومت کے کسی اعلا افسر سے ملاقات کی کوشش کی تھی۔ پھر بھی انھیں یہ خیال تھا کہ کسی وقت بھی ان پر مصیبت آسکتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے ایک شاگرد میر مہدی مجروح کے نام ۷ر فروری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں اس خدشے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں مخفی نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں۔ حکّام جانتے ہیں کہ یہاں ہے مگر نہ باز پُرس و داروگیر میں آیا ہوں، نہ خود اپنی طرف سے قصد ملاقات کیا ہے۔ بہ ایں ہمہ ایمن میں بھی نہیں ہوں۔ دیکھیے انجامِ کار کیا ہے؟''[۴]

(مجروحؔ، ۷ر فروری ۱۸۵۸ء)

رام پور کے نواب یوسف علی خاں برطانوی حکومت سے بہت قریب تھے۔ اُنھوں نے جنگِ آزادی میں برطانوی حکومت کی خاصی مدد کی تھی، اس لیے غالبؔ نے اُنھیں ایک طویل خط لکھ کر

کوشش کی کہ وہ حکومت سے اُن کی سفارش کریں۔

''......واز مئی (۱۸۵۷ء) خود آشکار است کہ حال چیست؟ پیوندِ تعلّق با بہادر شاہ جز آن نبود کہ از ہفت ہشت سال بہ تحریرِ تاریخِ سلاطینِ تیموریہ و از دو سہ سال بہ اصلاحِ اشعارِ شہریاری پرداختم۔ درین ہنگامہ خود را بکنار کشیدم و بدین اندیشہ کہ مبادا گر یک قلم ترکِ آمیزش کنم، خانۂ من بتاراج رود، و جان در معرضِ تلف افتد، بہ باطن بے گانہ و بہ ظاہر آشنا ماندم ہرگاہ شہر بدستِ سپاہِ انگریز فتح شد، ہمہ جاگیرداران و پنسن داران از شہر بدر رفتند، چناں کہ تا امروز آوارۂ دشت و کوہ اند، من از جانہ جُنبیدم و ہم چناں گوشہ گیر ماندم۔ درین بندوبست کہ خاصہ از بہرِ سیاستِ مجرمان است و تحقیقاتِ جُرم از روی دفترِ قلعہ و اظہارِ مخبران می کنند، ہیچ گونہ آلایشِ دامنِ من پدید نیامد و دار و گیر و باز پرس رو نہ داد۔ بودنِ من در شہر از حکّام نہاں نیست۔ امّا چوں پُرسشی درمیان، نیست، لاجرم محفوظ ماندہ ام۔ می بایست کہ خود سلسلہ جنبان کشتی و باحکّام پیوستمی۔ درین بارہ سخن آن ست کہ درین فرماندہان با ہیچ کس سابقۂ معرفتی ندارم و معہذا ہنوز موقع و محلِ آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم و خواہشِ ملاقات بہ میان آورم۔

راستی این کہ درین فتنہ و آشوب خدمتی بجانیاوردہ ام، لیکن مقامِ شکر است کہ بہ تقدیم نرسیدن خدمت ازراہِ بے دستگاہی است، و ذریعۂ اخلاص و خلوص ہمان بے گناہی است۔''[۵]

(نواب یوسف علی خاں، ۱۴؍جنوری ۱۸۵۸ء، ص ص ۸۔۹)

اکبر آباد کے کوئی انگریز حاکم غالباً دہلی آئے۔ یہ بقول غالبؔ اُن کے آشنائے قدیم تھے لیکن غالبؔ نے احتیاطاً اُن سے بھی ملاقات نہیں کی۔ البتہ اُنھیں خط لکھا جس کے جواب سے محروم رہے۔ غالبؔ تفتہ کے نام ۵؍مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں:

''میرا حال بہ دستور ہے، دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے؟ حاکمِ اکبر آباد نے آکر کوئی نیا بندوبست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب، میرے آشنائے قدیم ہیں مگر میں مل نہیں سکتا۔ خط بھیج دیا ہے، ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔''[۶]

(تفتہ، ۵؍مارچ ۱۸۵۸ء)

مارچ ۱۸۵۸ء کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں حکومت نے اپنے کسی محکمے سے غالبؔ کی پنشن کی کیفیت دریافت کی۔ کیفیت دریافت کرنے والے خط میں غالبؔ کے خلاف کوئی بات نہیں تھی جس کی وجہ سے غالبؔ کو ذہنی سکون حاصل ہوا۔ اُنھوں نے تفتہؔ کو ۱۲ر مارچ ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''بہ ہر حال، یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکّام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو (۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے) لگاؤ نہ تھا۔'' [۷]

غالبؔ نے جب دیکھا کہ حکومت اُن کی پنشن کی انکوائری کر رہی ہے تو انھیں یقین ہو گیا کہ حکومت کی نظر میں وہ بے گناہ ثابت ہو گئے ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے پنشن کے لیے حکومت کو درخواست دے دی۔ غالبؔ کو یہ خیال تھا کہ اگر پنشن جاری ہو بھی گئی تو اُن کا گزارہ کیسے ہو گا لیکن ایک بات ایسی تھی جس کی وجہ سے غالبؔ کو ذہنی سکون حاصل ہو گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ پنشن کی انکوائری شروع ہونے پر اُنھیں یقین ہو گیا کہ حکومت کی نظر میں بے گناہ ثابت ہو گئے ہیں۔ اُنھوں نے اپریل ۱۸۵۸ء میں غلام نجف خاں کو لکھا:

''پنشن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بہ شرطِ اجرا بھی میرا کیا گزارہ ہو گا؟ ہاں، دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام: ''چولھے ولدّر نہ ہو گا۔'' [۸]

غالبؔ نے ۷ر نومبر ۱۸۵۸ء میں نواب یوسف علی خاں کو ایک خط میں اطلاع دی ہے کہ اگرچہ اُن کا قلعے سے تعلق تھا لیکن اُن کی نسبت حکومت کو کسی طرح کے جرم کا احتمال بھی نہیں ہے۔

''خدا کا شکر ہے کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ، کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔'' [۹]

پنشن کے بارے میں حکومت کی سطح پر تحقیق کو کئی مہینے گزر گئے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور کسی طریقے کی باز پُرس بھی نہیں ہوئی۔ غالبؔ ۲۱ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

''حقیقتِ حال، اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں

گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں، کسی محکمے میں اب تک بلایا نہیں گیا، معرضِ باز پُرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے؟''[10]

اگست ۱۸۵۸ء میں دہلی کے ڈپٹی کمشنر نے غالبؔ کو بلایا اور پوچھا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے دوران تم کہاں تھے؟ غالب نے اس سوال کا مناسب جواب دے دیا اور ڈپٹی کمشنر کی گفتگو کے انداز سے غالب کو خیال ہوا کہ اُن کی پنشن جاری ہو جائے گی۔ غالبؔ، غلام نجف خاں کو جولائی۔ اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھ کو ڈپٹی کمشنر نے بلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ ''غدر'' میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہوا، وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدۂ ولایت، میں نے پڑھائے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ انداز و ادا سے پنشن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے۔''[11]

یوسف مرزا کے نام ۱۸۵۹ء میں غالبؔ نے ایک حقیقت کو اس طرح لکھا ہے کہ دہلی کے امرا اور خاص طور سے وہ لوگ، جن کا قلعے سے تعلق تھا۔ حکومت کی نظر میں اتنے بدنام ہو گئے تھے کہ لوگ اُن سے ملتے ہوئے ڈرتے تھے۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

''دلّی کے اُمرا خصوصاً اُمرائے شاہی ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سایے سے بھاگتے ہیں۔''[12]

کچھ ہی دن بعد غالبؔ نے یہ بات دوسرے الفاظ میں لکھی ہے۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

''رفع فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلّم۔ یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے، یہ داغ اُن کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا۔''[13]

حکومت غالبؔ کے معاملات کا کوئی فیصلہ نہیں کر رہی تھی۔ اگرچہ انکوائری شروع ہو گئی تھی لیکن ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا۔ غالب اپنی پنشن اور حکومت سے اپنے تعلقات کی طرف سے خاصے پریشان تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ وہ واقعی بے گناہ ہیں اور ان کی بے گناہی کا گواہ خود اُن کی ذات کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اُنھوں نے ۲۰ر جنوری ۱۸۵۹ء کو غلام غوث خاں بےخبرؔ کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

''گناہ گار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ

ہوں۔ مقیّد اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔"[۱۴]

۷/نومبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں غالبؔ نے نواب یوسف علی خاں کو اپنے حالات کے بارے میں لکھا:

"مفصّل لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمانِ قلعہ پر شدّت ہے اور بازپُرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اِصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں، خواہی اُس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اِس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر، شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکّام کو معلوم ہے، مگر چوں کہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔

اور یہ جو بادشاہ اور شاہ زادوں کے انجام کے متعلّق میں نے کچھ نہیں لکھا (حالاں کہ ان واقعات کو) فتحِ شہر کی داستان کے دیباچے کے طور پر (آغاز ہی میں) لکھنا چاہیے تھا۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شنیدہ ہیں اور ابھی بغیر سُنی ہوئی باتیں بہت ہیں یقیناً جب میں اس جائے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سُنی ہیں اِدھر اُدھر سے جمع کروں گا اور تب واقف کاروں کی طرح یہ راز کی باتیں لکھوں گا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے (واقعاتِ) داستان کی تقدیم و تاخیر پر از روے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔"[۱۵]

۵/دسمبر ۱۸۵۷ء کو غالبؔ نے تفتہؔ کو دہلی میں جرنیلی بندوبست کے بارے میں لکھا:

"مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بلکہ ہنوز ایسے اُمور کی طرف حکّام کی توجّہ بھی نہیں، دیکھیے

انجام کار کیا ہوتا ہے؟"[16]

غالبؔ خطوں میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور اپنی ذات کے بارے میں کچھ بھی لکھتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اُنھوں نے غلام نجف خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"جو کہتے ہو کہ: "تم نے کبھی مجھ کو خط نہیں لکھا اور اگر شیخ نجم الدین حیدر کا خط نہ آتا تو اب بھی نہ لکھتے۔" انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھوں؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں؟ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔[17]

غلام نجف خاں کے نام ۱۹/ جنوری ۱۹۵۸ء کے ایک خط میں غالبؔ نے لکھا ہے:

"بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے، مگر لکھ نہیں سکتا۔ اگر ملاقات ہوگی تو پھر بات کریں گے۔"

"جو دم ہے، غنیمت ہے، اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں اور گھڑی بھر کے بعد کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ اِناّ لِلّٰہ وَاِنّآ اِلَیْہِ راجِعُون۔"[18]

غالبؔ یہ خیال رکھتے تھے کہ اگر اُن کا خط حکومت کے ہاتھ آ گیا تو وہ گرفت میں نہ آئیں۔

غالبؔ نے انورالدولہ شفقؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"مُنہ پیٹتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا، الٰہی حیاتِ جاوِدانی نہیں مانگتا، پہلے انورالدّولہ سے مل کر سرگزشت بیان کروں، پھر اس کے بعد مروں۔"[19]

میر مہدی مجروحؔ نے غالبؔ سے اُن کی پنشن کے بارے میں دریافت کیا۔ غالبؔ ۷/ فروری ۱۸۵۸ء کے خط میں جواب دیتے ہیں:

"کیا پنشن اور کہاں اس کا ملنا! یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

ہے موجزن اِک قلزمِ خوں کاش یہی ہو!

آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے!

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔''[20]

'انتخابِ غالب' میں غالبؔ کی ایک تحریر شامل ہے۔اس تحریر میں بھی غالبؔ نے وہی کچھ کہا ہے جس سے اُن کی برّیت ہو سکے۔غالب لکھتے ہیں:

''غدر کے دنوں میں نہ شہر سے نکلا، نہ پکڑا گیا، نہ میری رُوبکاری ہوئی۔ جس مکان میں رہتا تھا، وہیں بدستور بیٹھا رہا۔بلّی ماروں کے محلّے میں میرا گھر تھا۔ناگاہ ایک دن آٹھ سات گورے دیوار پر چڑھ کر اُس خاص کوچے میں اُتر آئے، جہاں میں رہتا تھا۔اُس کوچے میں بہ ہمہ جہت ۵۰ یا ۶۰ آدمی کی بستی ہوگی، سب کو گھیر لیا اور اپنے ساتھ لے چلے۔مگر گرفتار نہیں کیا اور کسی کو بے حرمت نہیں کیا، نرمی سے لے چلے۔راہ میں سرجن بھی آملا۔وہ مجھے کرنل برون کے پاس لے گیا۔وہ چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اُترے ہوئے تھے۔باہر نکل آئے اور میرا صرف نام پوچھا۔اوروں سے نام بھی نہ پوچھا۔کرنل صاحب نے فرمایا کہ اسداللہ خاں بڑے تعجب کی بات ہے کہ باؤٹے پر نہ آئے۔میں نے کہا کہ تلنگے، دروازے سے باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے۔میں کیوں کر آتا؟ (پھر) میری صورت کو دیکھیے اور میرا حال معلوم کیجیے بوڑھا ہوں، پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، نہ لڑائی کے لائق، نہ مشورت کے قابل۔ہاں دعا کرتا، سو یہاں بھی دعا کرتا رہا۔کرنل صاحب ہنسے اور فرمایا:''اچھا، تم اپنے گھر جاؤ اور اپنے نوکروں اور اپنے علاقہ داروں کو ساتھ لے جاؤ۔باقی اہلِ محلّہ سے غرض نہ رکھو۔میں خدا کا شکر بجا لایا اور کرنل صاحب کو دعا دیتا ہوا اپنے گھر آیا۔''غالبؔ کے ہم زُلف نواب غلام حسین کی روایت اس بارے میں قدرے مختلف ہے۔''[21]

۷؍نومبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالبؔ نے نواب یوسف علی خاں کو نئے حالات کی اطلاع ان الفاظ میں دی:

''اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بے گناہ ہوں یا گنہہ گار؟ مقبول ہوں یا مردود؟ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں۔ لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔''[۲۲]

لیکن یہ غالبؔ کی خوش فہمی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے سلسلے میں ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔ غالبؔ اپنی پنشن کے سلسلے میں دہلی کے کمشنر سے ملنے گئے تو یہ خوش فہمی بھی دور ہوگئی۔ اُنھوں نے اس کی تفصیل حسین مرزا کو ۱۸؍جون ۱۸۵۹ء کے خط میں ان الفاظ میں لکھی ہے:

''اب میرا دُکھ سنو: بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی بے وفائی و نمک حرامی کا دھبّا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور، غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا، اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالبؔ نے یہ سکّہ کہہ کر گزرانا ؎

بہ زر زد سکّۂ کشورستانی
سراج الدین بہادر شاہِ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔ اس وقت تو چپکا ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکاری لکھوا گیا کہ یہ جو اسد اللہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکّہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔''[۲۳]

حقیقت یہ ہے کہ اس الزام کی سنجیدگی اور اس کے نتائج و عواقب کے خیال سے غالبؔ حواس باختہ ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اپنے دوستوں سے اس واقعے کا ذکر کیا تو میر روشن علی کے والد میر احمد حسین نے انھیں جو کچھ بتایا وہ غالبؔ نے اپنے خط میں حسین مرزا کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

”بھائی، یہاں منشی میر احمد حسین والد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا، وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا۔ اُن کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبرِ وفات اکبر شاہ وجلوسِ بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اس سکّے کا گزارنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں واقع ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع رکھتے ہیں۔ اگر وہاں کہیں اس کا پتا پاؤ گے اور وہ پرچہ اخبار اصل بجنسہٖ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔ میں نے اکبر آباد و فرخ آباد و مارہرہ و میرٹھا اپنے احباب کو لکھا ہے۔ اب تم کو بھی لکھا۔ ایک کالپی کو لکھنا باقی ہے۔ وہ بھی کل پرسوں لکھوں گا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء تین مہینوں کے بارہ پرچہ اخبار دیکھے جائیں۔“ [۲۴]

غالبؔ نے ’دہلی اردو اخبار‘ کے اس شمارے کی بہت تلاش کی جس میں اُن کی اطلاع کے مطابق مولوی محمد باقر کے ’دہلی اخبار اردو‘ میں یہ سکہ ذوقؔ کے نام سے چھاپا گیا تھا۔ غالبؔ نے ’دہلی اردو اخبار‘ کے اس شمارے کی بہت تلاش کی۔ کئی دوستوں کو خطوط لکھے مگر بے سود۔ اُن پر یہ الزام برقرار رہا۔ غالبؔ نے جون ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرور کو لکھا:

”جنابِ چودھری صاحب! آج کا خط کاسۂ گدائی ہے یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ کہ مولوی محمد باقر دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا، مسمّٰی بہ ’دہلی اردو اخبار‘ بعض اشخاص سنینِ ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے آگے کے اوراق دیکھے جائیں، جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوقؔ کے دو سکّے اُن کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو، بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں، آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ذوقؔ نے اس مہینے کے بعد سکّے کہہ کر گزرانے ہیں۔ احتیاطاً پانچ چار مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام (اِصرار) ہے کہ اگر بمشکل کسی اور شہر میں کوئی آپ کا دوست جامع ہو

اور آپ کو اس پر علم ہو تو وہاں سے منگوا بھیجیے۔''[۲۵]

غالبؔ کو کہیں سے بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تو اُنھوں نے اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرورؔ کو لکھا:

'سکّے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں یعنی جب بہادر شاہ ظفر تخت پر بیٹھے تو ذوقؔ نے یہ دو سکّے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوقؔ کے معتقدین میں تھے، اُنھوں نے 'دہلی اردو اخبار' میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب تک وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اُس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکّے سنے ہیں اور اُن کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے ہر چند قلمروِ ہند میں 'دلّی اردو اخبار' کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبّا مجھ پر رہا، پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان، خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا۔ چوں کہ موافق رضائے الٰہی ہے، اس کا گِلہ کیا:

چوں جنبشِ سپہر بہ فرمانِ داورست

بے داد نبود آنچہ بما آسماں دہد[۲۶]

جب سکّہ ملنے کی اُمید بالکل ختم ہوگئی تو غالبؔ نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیا کہ اوّل تو اُنھوں نے یہ سکّہ نہیں لکھا اور اگر لکھا ہے تو یہ جرم ایسا نہیں ہے، جسے معاف نہ کیا جا سکے۔ انھوں نے جون ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں یوسف مرزا کو لکھا:

''وہ 'دہلی اردو اخبار' کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے، ورنہ خیر کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حُکّام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکّہ کہا نہیں، اگر کہا تو اپنی جان و حُرمت بچانے کو کہا یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے؟ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟

ہاں صاحب، گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔'' ۲۷

مالک رام صاحب کو قلعے میں متعین انگریزوں کے جاسوس گوری شنکر کی رپورٹ ملی تھی جو اُس نے پوشیدہ طور پر انگریزوں کو بھیجی تھی۔ یہ رپورٹ بقول مالک رام صاحب ''۱۹ر جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھی گئی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے گوری شنکر نے لکھا ہے:

''دی روز یعنی (۱۸ر جولائی ۱۸۵۷ء) اسد اللہ خاں غالبؔ نے سکۂ زر ایک پرچے پر لکھا۔ وہ سکہ ہے:

بزر زد سکّہ کشورستانی

سراج الدین بہادر شاہ ثانی ۲۸

بقول مالک رام صاحب یہ وہ رپورٹ ہے جس کی طرف کمشنر نے غالبؔ سے ملاقات کے دوران ذکر کیا تھا۔ اگر یہ رپورٹ درست تھی تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب پر یہ الزام بھی درست تھا لیکن اس مقالے میں مالک رام صاحب 'صادق الاخبار' (۱۳ ذی قعد ۱۲۷۳ء، جلد ۴ کا ایک شمارہ) کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں کہ غالبؔ پر اس سکّے کی تصنیف کا الزام بے بنیاد تھا۔ اس کے اصل مصنف محمد ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد حافظ غلام رسول تھے۔ 'صادق الاخبار' میں یہ خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی ہے

''سکۂ نوطبع زاد، جناب حافظ صاحب، ویران شاگردِ رشید استاد ذوقؔ مرحوم

بزر زد سکۂ کشورستانی

سراج الدین بہادر شاہ ثانی'' ۲۹

مزید بحث کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ گوری شنکر نے سکّے کے متعلق یہ رپورٹ ۱۹ر جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھی تھی۔ اس واقعے سے چھ دن پہلے انگریزوں کے ایک اور جاسوس منشی جیون لال، انگریزوں کو یہ اطلاع دے چکے تھے کہ (فتحِ آگرے کے مژدے سے سب، بادشاہ و اہلِ قلعہ خوش تھے) مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ایک قصیدہ مِن تصنیفِ خود بادشاہ کی مدح میں پڑھے ہیں۔'' ۳۰

اس کی تصدیق اخبارِ عالم تاب سے بھی ہوتی ہے جو آگرے سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار میں اس

قصیدے کے بارے میں خبر شائع ہوئی تھی کہ:

"مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے من تصنیف خود ہا (۱۳ر جولائی ۱۸۵۷ء) بادشاہ کی مدح میں قصیدے پڑھے تھے۔" [۳۱]

اس کے دو تین دن بعد یعنی ۱۱ر اگست ۱۸۵۷ء کو غالبؔ نے شاہی دربار میں ایک قصیدہ پڑھا جس کا ذکر عبداللطیف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"۱۱ر اگست ۱۸۵۷ء نجم الدولہ اسداللہ خاں غالبؔ نے ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کو سنایا اور خلعت زیب تن کیا۔" [۳۲]

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ غالبؔ زمانۂ غدر میں (میرے خیال میں جب تک ہندوستانیوں کا پلڑا بھاری رہا۔) دربار شاہی میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اگست کے وسط تک دلّی میں عام فضا یہی تھی کہ جیت ضرور ہندوستانیوں کی ہوگی، اسی لیے غالبؔ نے (اطلاعاتِ بالا کے مطابق) ظفر کی شان میں کم سے کم دو قصیدے پڑھے اور خاص طور پر اب تک کی معلومات کے پیشِ نظر اُنھوں نے پہلا قصیدہ اس وقت پڑھا، جب شاہی فوجوں کو آگرے پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ آگرے میں انگریزوں کی شکست واضح طور پر ہندوستان میں انگریزوں کی مکمل شکست کی نشان دہی کرتی تھی اور اسی واقعے نے غالبؔ کو مدحِ ظفر کی جرأت دلائی۔

قصّہ کوتاہ، غالبؔ کا خیال تھا کہ فتح بالآخر ہندوستانیوں کی ہوگی، اس لیے اُنھوں نے بادشاہ کی مدح میں کم سے کم دو قصیدے پڑھے لیکن ان پر جس سکّے کا الزام تھا، اس کے اصلی مصنّف غالبؔ نہیں، حافظ ویران تھے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے روزنامچۂ جیون لال سے مندرجۂ ذیل عبارت نقل کی ہے جو جیون لال نے ۱۹ر مئی ۱۸۵۷ء کے تحت لکھی ہے:

"دربار شاہی منعقد ہوا۔ مولوی ظہور علی تھانے دار نے حاضر ہو کر ایک سکّۂ جلوس دربابتِ تخت نشینی حضور (میں) گزرانا............ دیگر سکّۂ شعر۔ مرزا نوشہ:

بر زرِ آفتاب و نقرۂ ماہ

سکّہ زد در جہاں بہادر شاہ [۳۳]

گویا اب دو سکّے ایسے ہو گئے جن کی تصنیف کا الزام غالبؔ پر ہے۔ یہاں ایک دل چسپ بات کا ذکر ضروری ہے کہ مالک رام صاحب، پروفیسر فاروقی اور بیشتر محققوں نے جنھوں نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے، یہی تسلیم کیا ہے کہ غالب پر ایک سکّہ کہنے کا الزام تھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ جب غالبؔ کمشنر سے مل کر آئے تھے تو انھیں یہی بتایا گیا تھا کہ اُنھوں نے ایک سکّہ کہا تھا یعنی وہی۔ بزرز دسکّہ کشورستانی۔ الخ...... کچھ ہی دن بعد غالب کو معلوم ہوا کہ ان پر ایک نہیں، دو سکّے کہنے کا الزام ہے۔ غالبؔ کو یہ خیال تھا کہ اُن پر جن سکّوں کا الزام ہے، وہ ذوقؔ کی تصنیف ہیں، اس لیے ایک کی بجائے دو سکّوں کے اشاعت کی تلاش شروع ہوئی۔ غالب اپنے ایک دوست چودھری عبدالغفور سرورؔ کو لکھتے ہیں:

"جناب چودھری صاحب آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں.......... (دہلی اردو اخبار کے جس شمارے میں) بہادر شاہ کی تخت کا ذکر اور میاں ذوقؔ کے دو سکّے ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو۔ بے تکلّف وہ اخبار چھاپہ کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔" ۳۴

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ غالبؔ سکّہ کہنے کی اہمیت اور اس کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ جنوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں وہ مہاراجہ سردار سنگھ والیِ بیکانیر کو لکھتے ہیں:

"سکّہ مبارک کے تین نقشے بھیجتا ہوں۔ دو مع تصویر اور اس میں سکّہ منظوم یعنی ایک شعر جیسا کہ سلاطینِ ماضی کا ہر ملک میں دستور ہے اور ایک نثر۔ ان نقشوں میں سے جو نقشہ سری مہاراج کو پسند آئے وہ حضور کو مبارک ہو۔" ۳۵

غالبؔ کا یہ کہنا کہ "اوّل تو میں نے سکّہ کہا نہیں" ہرگز درخورِ اعتنا نہیں۔ غالبؔ ایسے معاملوں میں مستقل دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔ اُنھوں نے کئی بار اپنے دوستوں اور شاگردوں کو ذاتی خطوں میں لکھا ہے کہ غدر شروع ہوتے ہی میں نے خود کو گھر میں بند کر لیا تھا۔ جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایامِ غدر میں غالب قلعے جاتے رہتے تھے۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دورانِ غدر میں غالبؔ نے کم سے کم دو قصیدے ظفرؔ کی مدح میں پڑھے تھے۔ عبداللطیف نے ۲۵ رمئی کے تحت لکھا ہے:

''ٹکسال کا کام منشی اجودھیا پرشاد کے سپرد کیا گیا...... اس کام میں نہایت اہتمام کیا گیا اور تیزی سے سکہ بننا شروع ہوا۔ سکہ کا چہرہ اس طرح روشن ہوا۔''

سکہ زد در جہاں بفضلِ الٰہ

شاہِ ہندوستاں بہادر شاہ

عبداللطیف نے اس سکے کے مصنف کا نام نہیں بتایا۔ میرا قیاس ہے کہ یہی سکہ غالبؔ کا کہا ہوا ہے۔ اگر چہ غدر کے زمانے میں کئی لوگوں نے سکے کہے تھے۔ لیکن جو سکے دہلی میں تیار ہوتے تھے۔ ان پر غالبؔ کے علاوہ کسی اور کا سکہ لکھا جانا قرینِ قیاس نہیں۔ اوّل تو غالبؔ کی حیثیت کا کوئی شاعر اُس وقت دہلی میں موجود نہیں تھا، ذوقؔ اور مومنؔ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسرے، غالبؔ نہ صرف درباری شاعر تھے بلکہ ظفرؔ کے استاد بھی تھے، اس لیے بھی احتراماً ضروری تھا کہ غالبؔ نے کچھ اور سکے کہے ہوں۔ کیوں کہ گوری شنکر اور جیون لال سکہ نقل کرنے میں تو غلطی کر سکتے ہیں لیکن بے وجہ غالبؔ پر الزام لگانے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔ غالبؔ نے گوری شنکر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''یہاں ایک اخبار گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا۔''[۳۶]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ غالبؔ کی گوری شنکر سے کوئی ذاتی مخاصمت نہیں تھی بلکہ وہ اس سے واقف بھی نہیں تھے، اس لیے میرا خیال ہے کہ جن تاریخوں میں جیون لال (۱۹ رمئی ۱۸۵۷ء) اور گوری شنکر (۱۸ رجولائی ۱۸۵۷ء) نے لکھا ہے کہ غالبؔ نے سکہ کہا، غالبؔ نے واقعی سکے کہے تھے۔ چوں کہ ان دنوں ہر چھوٹا بڑا شاعر سکہ کہہ رہا تھا، اس لیے ان دونوں جاسوسوں نے غلط سکے نقل کر دیے۔ آخر میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میرا قیاس ہے کہ غالبؔ نے جتنے بھی سکے کہے سب زبانی پیش کیے ہوں گے۔ چناں چہ عام فضا یہ تھی کہ جیت ہندوستانیوں کی ہوگی مگر پھر بھی دوراندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ اپنی تحریر نہ دی جائے۔ انگریزوں نے دہلی فتح کرنے کے بعد قلعے کے تمام کاغذات اپنے تصرّف میں لے لیے تھے۔ ان میں سے بعض کاغذات نیشنل آرکائیوز میں میری نظر سے گزرے ہیں۔ غدر کے دنوں میں شاہی دربار میں جو روزنامچہ لکھا جاتا تھا، وہ بھی نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ لیکن ان میں غالبؔ کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ پھر غالبؔ نے کئی بار یہ بات اپنے خطوں میں دہرائی ہے کہ دفترِ قلعہ سے کوئی

میرا کاغذ نہیں نکلا...... اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا نکلتا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا۔

اگر غالبؔ کی کوئی تحریر دفتر شاہی میں ہوتی تو غالبؔ اس اعتماد اور یقین کے ساتھ یہ بات نہ کہتے۔ گوری شنکر نے البتہ یہ لکھا ہے کہ ''غالب نے ایک سکّہ زر پرچے پر لکھا۔'' گوری شنکر نے یہ نہیں کہا کہ پرچے پر لکھ کر بہادر شاہ ظفرؔ کو پیش کیا۔ اِمکان یہ ہے کہ غالب نے وہیں بیٹھے بیٹھے دو مصرعے کہے۔ پرچے پر لکھ کر بادشاہ کو سنائے اور پرچا اپنے پاس ہی رہنے دیا۔

غدر کے موضوع پر معین الدین حسن خاں کی کتاب 'خدنگِ غدر' میں ایک سکّے کا ذکر کیا ہے جو گوری شنکر کے بتائے ہوئے سکّے کی بدلی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے۔ سکّے کے پہلے مصرعے کے آخر میں ''کشورستانی'' کو ''نصرت طرازی'' سے اور دوسرے مصرعے کے آخر میں ''ثانی'' کو ''غازی'' سے بدل دیا گیا ہے اور اب یہ سکہ اس طرح ہو گیا:

''بزر زد سکہ نصرت طرازی

سراج الدیں بہادر شاہ غازی

معین الدین حسن خاں نے اپنی کتاب 'خدنگِ غدر' میں لکھا ہے کہ:

> ''بریلی سے خان بہادر خاں نے نذر وعرضی بھیجی۔ بادشاہ کی طرف سے خلعت مرحمت ہوا۔ لکھنؤ سے مرزا عباس نذرِ تاجِ سلطانی مع روپیہ واشرفی سکّہ بہادر شاہی، سکہ
>
> بزر زد سکہ نصرت طرازی
>
> سراج الدیں بہادر شاہ غازی[۳۷]

بقول اسلم پرویز:

> ''گوری شنکر نے جو غدر کے زمانے میں انگریزوں کی جاسوسی کر رہے تھے۔ یہ خبر دی کہ ۱۸ر جولائی ۱۸۵۷ء کو غالب نے ایک پرچے میں یہ سکہ لکھا:

"بزر زد سکۂ کشورِستانی

سراج الدین بہادر شاہ ثانی"

اسلم پرویز نے یہ بھی لکھا ہے:

"جب لکھنؤ میں باغی فوج نے جمع ہوکر واجد علی شاہ کے گیارہ سالہ فرزند برجیس قدر کو اودھ کے تخت پر بٹھایا تو ٹکسال جاری ہوئی اور سکّے پر بہادر شاہ کی ضرب پڑی۔ بعد میں برجیس قدر کی جانب سے بہادر شاہ ظفر کو جو نذر بھیجی گئی، اس میں تاج جواہر نگار، ایک سو اشرفی اور پانچ ہزار روپیہ زرِ نقد اور ضربِ سکہ شامل تھی۔ سکّے میں جو ترمیم نظر آتی ہے اس سے ایک خیال یہ بھی گزرتا ہے کہ حافظ ویران کا جو سکہ ۱۸۵۷ء کے 'صادق الاخبار' میں چھپا تھا اس سکّے میں ہنگامی حالات کے مطابق ترمیم کر کے شاید "نصرت طرازی" اور "غازی" کے الفاظ شامل کر دیے گئے ہوں۔"[۳۸]

ایسے شواہد موجود ہیں کہ دورانِ غدر بعض ایسے سکّے کندہ کیے گئے تھے جن سے غالب کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ لال قلعے میں جب بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا تو حکیم احسن اللہ خاں نے گواہی دیتے ہوئے کہا تھا:

"تین یا چار باغی رجمنٹوں نے لکھنؤ سے بادشاہ کو درخواست بھیجی تھی اور یہ تحریر کیا تھا کہ ہم اودھ لینے کے بعد دہلی روانہ ہوں گے۔ ہم نے اس وقت انگریزوں کو بیلی گھاٹ پر گھیر رکھا ہے۔ قدرت اللہ خاں رسالہ دار جو سپاہیوں کے ساتھ اودھ کے رسالوں کی جانب سے یہ درخواست لایا تھا اسے بخت خاں نے بادشاہ کے روبرو پیش کیا۔ اس نے بادشاہ کے نام کا نیا سکّہ نذر کیا جس پر یہ عبارت کندہ تھی:

"سراج الدین بہادر شاہ غازی نے سونے کا سکّہ بیادگار فتح تیار کرایا۔"[۳۹]

حواشی

(سکّے کا الزام)

۱۔ غالب کے خطوط:۱:۲۷۲

۲۔ غالب کے خطوط:۱:۲۶۷۔۲۶۹

۳۔ غالب کے خطوط:۱:۲۶۸۔۲۶۹

۴۔ غالب کے خطوط:۲:۴۹۲

۵۔ مکاتیب غالب: چھٹا اڈیشن:۱۳(اڈیشن ۱۹۴۹ء)

۶۔ غالب کے خطوط:۱:۲۷۰

۷۔ غالب کے خطوط:۱:۲۷۲

۸۔ غالب کے خطوط:۲:۶۲۶

۹۔ مکاتیب غالب، چھٹا اڈیشن:۸۔۹

۱۰۔ غالب کے خطوط:۲:۶۲۳

۱۱۔ بنام غلام نجف خاں، غالب کے خطوط:۲:ص ۶۲۸

۱۲۔ بنام یوسف مرزا، غالب کے خطوط:۲:۶۷۷

۱۳۔ غالب کے خطوط:۲:۶۴۳

۱۴۔ غالب کے خطوط:۲:۵۹۰

۱۵۔ دستنبو، اردو ترجمہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی: ۱۲۹

۱۶۔ غالب کے خطوط: ۱: ۲۶۸

۱۷۔ غالب کے خطوط: ۲: ۶۲۴

۱۸۔ غالب کے خطوط: ۲: ۶۲۴

۱۹۔ غالب کے خطوط: ۳: ۹۸۵۔۹۸۶

۲۰۔ غالب کے خطوط: ۲: ۴۹۱

۲۱۔ غالب نام آور: ص ۱۱۵

۲۲۔ غالب کے خطوط: ۳: ۱۱۸۷

۲۳۔ غالب کے خطوط: ۲: ۶۷۴۔۶۷۵

۲۴۔ غالب کے خطوط: ۲: ۶۷۵

۲۵۔ غالب کے خطوط: ۲: ۵۹۸

۲۶۔ غالب کے خطوط: ۲: ۶۰۴

۲۷۔ غالب کے خطوط: ۲: ۶۸۷

۲۸۔ سہ ماہی معارف، اعظم گڑھ، اگست ۱۹۵۸ء: ۱۴۴

۲۹۔ سہ ماہی معارف، اعظم گڑھ، اگست ۱۹۵۸ء، ۱۴۹

۳۰۔ سہ ماہی صحیفہ، لاہور، ۱۹۶۹ء: ۲۷۲

۳۱۔ سہ ماہی صحیفہ، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۲

۳۲۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، عبداللطیف، ص ۱۵۸

۳۳۔ سہ ماہی صحیفہ، غالب نمبر ۲۶۹ء: ص ۲۷۱

۳۴۔ غالب کے خطوط: ۲: ۶۰۴

۳۵۔ غالب کے خطوط:۲:ص۷۵۱

۳۶۔غالب کے خطوط:۲:۶۷۴۔۶۷۵

۳۷۔ بہادر شاہ ظفرؔ، طبع دوم:ص۲۵۶

۳۸۔ بہادر شاہ ظفرؔ، طبع دوم:ص۲۵۶

۳۹۔ چراغِ دہلی، ص۲۴۲

غالبؔ: ۱۸۵۷ء اور دستنبو

۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ پہلے غالبؔ کی مالی حالت کافی اطمینان بخش ہوگئی تھی۔انھیں انگریزی سرکار سے ساڑھے سات سو روپے سالانہ پنشن کے ایک زمانے سے مل ہی رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے بھی تاریخ نویسی کے لیے چھ سو روپے سالانہ مقرر کر رکھا تھا۔مرزا فخرو چار سو روپے سالانہ بطور وظیفہ اور دس روپے ماہانہ باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے پھلوں کے لیے دیتے تھے۔اس طرح غالبؔ کو ایک سو پچپن روپے کچھ آنے ماہوار ملتے تھے۔۱۰رجولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو کا انتقال ہوگیا جس سے ۵۲۰ روپے سالانہ کی آمدنی بند ہوگئی۔لیکن لگ بھگ چھ سات مہینے بعد ۵رفروری ۱۸۵۷ء کو نواب یوسف علی خاں ناظم ان کے شاگرد ہوگئے۔اُنھوں نے پہلے ہی خط کے ساتھ ڈھائی سو (۲۵۰) روپے بھیجے جس سے مرزا فخرو والے نقصان کی تلافی ہوگئی۔لیکن تین مہینے بعد ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوگیا جس کی وجہ سے ان کی آمدنی کے تمام ذرائع یک لخت بند ہوگئے۔

انگریزوں نے مرزا فخرو کا اس شرط پر ولی عہد ہونا منظور کیا تھا کہ بادشاہ ہونے پر وہ قلعۂ معلی کی سکونت چھوڑ کر قطب صاحب چلے جائیں گے۔غالبؔ اس شرط کا مطلب خوب سمجھتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ اسی کے ساتھ مغل حکومت بھی ختم ہوجائے گی،اسی لیے وہ کوشش کرنے لگے کہ براہِ راست ملکۂ معظمہ سے تعلقات قائم کریں۔اس سلسلے میں اُنھوں نے ۹رنومبر ۱۸۵۵ء کو ایک اور قصیدہ لارڈ ایلن برا کو بھیجا کہ اسے ملکۂ معظمہ کی خدمت میں پیش کردیا جائے۔قصیدے کے ساتھ یہ درخواست بھی کی گئی تھی کہ انھیں ملکۂ معظمہ کی طرف سے خطاب عطا ہو، اور ان کے موجودہ خلعت اور پنشن میں اضافہ کیا جائے۔اس سلسلے میں ولایت سے کچھ خط و کتابت ہو ہی رہی تھی بلکہ انھیں کچھ امید بھی بندھ چلی تھی کہ ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو انقلابی دہلی میں داخل ہوگئے اور

تمام نظام درہم برہم ہوگیا۔ چار مہینے چار دن یعنی ۱۱رمئی سے ۱۴رستمبر تک دلی پر ہندوستانیوں کا مکمل قبضہ رہا۔ یوں تو ہر ہندوستانی کے لیے یہ بڑی سخت آزمائش کا وقت تھا لیکن جن لوگوں کے تعلقات انگریزوں سے اچھے رہے تھے، ان کی جان و مال دونوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کو واقعی انگریزوں سے ہمدردی تھی۔ ان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ، جو انگریزوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار عملی طور پر کر رہے تھے یعنی انگریزوں کے ہندوستانی جاسوسوں کی مدد کر رہے تھے۔ مثلاً شاہ بیگم نواب زینت محل، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ تھے جنھیں انگریزوں سے ہمدردی تو تھی، لیکن وہ حالات سے مجبور اور خاموش تھے۔

دستنبو

غالبؔ کے خطوط میں 'دستنبو' کی تصنیف کا ذکر پہلی بار ۱۸رجولائی ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں ملتا ہے۔ اس خط کے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ یہ خط خلیق انجم کی مرتبہ کتاب 'غالبؔ کی نادر تحریریں'، مطبوعہ، مکتبہ شاہراہِ دہلی، ۱۹۶۱ء، (ص ۳۴) میں شائع ہوا ہے [۱]

ان سب حالات کے باوجود غالبؔ کو یہ یقین تھا کہ حکومت انھیں بے گناہ سمجھتی ہے، اس لیے وقت آنے پر انھیں اپنا حق مل جائے گا۔ اسی لیے جب اُنھوں نے سنا کہ:

> "اسی (فروری) کے پُرشوکت مہینے میں کہ اس زمانے سے ماہِ فروردین (جو موسم بہار کا پہلا مہینہ ہے) تک جس میں آفتاب کی رونق و روشنی بڑھ جاتی ہے، سورج کو ابھی (برج حمل تک پہنچنے کے لیے) ایک مہینے کا سفر طے کرنا ہے، حاکمِ مہربان، خورشید طلعت، ستارۂ حشم سرجان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ چوں کہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ہندوستان، خصوصاً اس شہر (دہلی) میں آئے ان کی مدح میں قصیدہ بھیجا جائے۔ اس بنا پر اس والا شکوہ (سرجان لارنس) کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، جو تہنیتِ فتح اور خیر مقدمِ نوروز پر مشتمل تھا اور ۱۹رفروری کو جمعہ کے دن بذریعہ ڈاک بھیجا۔ [۲]

قوی اِمکان ہے کہ غالبؔ کو اس قصیدے کا کوئی جواب نہیں ملا۔ کیوں کہ جواب ملنے کی صورت میں

ممکن نہیں تھا کہ غالبؔ 'دستنبو' میں اس کا بڑے فخر کے ساتھ ذکر نہ کرتے۔[3] ۲۷ فروری ۱۸۵۸ء کو انگریزی حکومت نے بقولِ غالبؔ ''داد پژوہانِ رنجور'' کو حاضر ہونے کی اجازت دے دی اور پریشاں حال لوگوں کو اپنی پناہ میں لے لیا۔

اس بیان سے غالبؔ کی مراد غالباً یہ ہے کہ انگریزی حکومت نے اعلان کر دیا کہ وفادارانِ حکومت اپنی جائیداد اور اِملاک وغیرہ کے سلسلے میں درخواستیں دیں۔ موقع ملتے ہی اُنھوں نے اوائلِ مارچ میں چیف کمشنر کو براہِ راست خط لکھا، جس میں ستائش اور تہنیت کے بعد اصل مدعا بیان کیا۔[4]

بقولِ غالب، ۱۷ مارچ کو غالبؔ کو یہ اطلاع دی گئی کہ ''ایں نامہ جز ستایش و چشمِ روشنی ہیچ ندارد، ہیچگونہ ناگزیر نیست''[5] اور پنشن کے سلسلے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے یہ خط کلکٹر کو بھیج دیا گیا۔ کلکٹر نے اس پر کیا لکھا، اس کا غالبؔ کو قطعی علم نہیں تھا۔ البتہ حکومت کی اس کاروائی سے غالب کو یہ یقین ضرور ہو گیا کہ ان پر کوئی سنگین الزام نہیں ہے۔ وہ ۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء کو مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں اوپر والی درخواست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بہرحال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکّام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔''[6]

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پنشن کی بات یہیں رُک گئی۔ غالبؔ نے یاددہانی کرائی تو کوئی جواب نہیں ملا۔ غالب حکام سے ملنے کی درخواست کریں تو کوئی ملنے کو تیار نہیں، خط لکھیں تو کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس مشکل کا حل غالب نے یہ نکالا کہ 'دستنبو' کے نام سے ایک معذرت نامہ لکھنا شروع کیا۔ غالب کا دعویٰ ہے کہ یہ ان کا روزنامچہ ہے۔ وہ عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

> ''۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی، جو سنا گیا، وہ بھی ضمیمہ سرگزشت کرتا گیا۔''[7]

یہاں غالبؔ نے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ۱۱ مئی کو دروازہ بند کر کے گھر پر بیٹھ گئے تھے۔ غالب کے اس بیان کی حقیقت یہ ہے کہ ناکام انقلاب کے دوران وہ قلعے جاتے رہے تھے۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہنگامہ شروع ہوا ہے اور ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت غالب دربارِ شاہی میں

موجود تھے۔ عبداللطیف نے لکھا ہے:

''۱۹ ر رمضان، ۱۲ ر مئی ۱۸۵۷ء صبح کے وقت مرزا اسداللہ خاں غالبؔ ایوانِ شاہی میں آداب بجالانے کے لیے حاضر ہوئے اور زمیں بوسی سے سرخروئی حاصل کی اور ایک خرمہرہ پیش کیا۔ بادشاہ کے حکم سے ہر روز کے لیے مرتبہ ''خانہ زادی'' سے بہرہ اندوز ہوئے۔'' (ترجمہ صفحہ ۱۲۳) ''عبداللطیف نے ۱۹ ر ذی الحجہ، ۱۱ ر اگست ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں لکھا ہے کہ نجم الدولہ نواب اسداللہ خاں غالبؔ نے ایک قصیدہ لکھ کر سنایا اور خلعت زیب تن کیا۔''

(۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ از عبداللطیف، مرتبہ و مترجمہ خلیق احمد نظامی، دہلی ۱۸۵۸ء) نیز رجوع کیجیے: غدر کی صبح شام، حسن نظامی، دہلی ۱۹۲۶ء، ص ۱۶۹)

اور دوسرے 'دستنبو' اُن کا روزنامچہ ہے، جو وہ گویا اوّل دن سے لکھ رہے تھے۔ ان دونوں باتوں کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ غالبؔ کے پہلے بیان کی تردید کی جاچکی ہے بلکہ خود غالبؔ نے نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے خط میں یہ اعتراف کیا، دوسرا بیان تو ان کے خطوط میں 'دستنبو' کی تصنیف کا ذکر پہلی بار ۱۸ ر جولائی ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں ملتا ہے، جس میں اُنھوں نے لکھا ہے:

''میں نے بعد توطیہ و تمہید آغازِ مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی سرگزشت لکھی ہے۔''[8]

انقلاب کے بعد غالبؔ کا پہلا خط ۵ ر دسمبر ۱۸۵۷ء کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس تاریخ سے ۱۸ ر جولائی ۱۸۵۸ء تک نواب علاالدین احمد خاں علائیؔ، شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ، نواب یوسف علی خاں ناظمؔ، مرزا ہرگوپال تفتہؔ، مرزا حاتم علی بیگ مہر اور میر مہدی مجروحؔ کے نام غالبؔ کے کم سے کم بیس خطوط ملتے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی 'دستنبو' کی تصنیف کا ذکر نہیں ہے۔ چوں کہ 'دستنبو' میں مرزا ہرگوپال تفتہؔ کا ذکر بطورِ خاص تھا، اس لیے بھی غالبؔ اس تصنیف کے سلسلے میں تفتہؔ کو ضرور لکھتے۔ ۱۸ ر جولائی ۱۸۵۸ء کے بعد ۸ ر اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں غالبؔ 'دستنبو' کے بارے میں میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں:

''تم کو آگے اس سے لکھا تھا کہ تم اپنے اوراق کا فقرۂ اخیر لکھ بھیجو، اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو، تاکہ میں اس کے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر بھیج دوں۔''[9]

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی نقل مجروحؔ کو بھیجی تھی اور باقی بھیجنا چاہتے تھے۔ خطوطِ غالب میں ۸ر اگست ۱۸۵۸ء سے قبل اپریل اور مئی ۱۸۵۷ء کے خطوط شامل ہیں لیکن ان میں 'دستنبو' کا کوئی ذکر نہیں۔ غالباً مئی اور اگست کے درمیان غالبؔ نے مجروحؔ کو جو خط لکھے تھے، وہ ضائع ہوگئے اور یہی وہ زمانہ ہے (یعنی مئی اور ۷ر اگست کی درمیانی مدت) جب 'دستنبو' تصنیف ہوئی۔

یہاں ضمناً ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے:

غالبؔ نے ۷ر فروری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں مجروح کو لکھا ہے۔ ''نثر کیا لکھوں اور نظم کیا کہوں گا، وہی دو چار ورق اور بھی سیاہ کیے ہیں۔''[۱۰] اس عبارت کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''یہ غالباً 'دستنبو' کی طرف اشارہ ہے۔''

میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ کوئی اور تحریر ہوگی، 'دستنبو' نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میرے دلائل یہ ہیں۔ مجروح کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انقلاب کے آغاز میں پانی پت چلے گئے تھے۔ چوں کہ اس کی مجھے قطعی شہادت نہیں ملی، اس لیے میں فرض کر لیتا ہوں کہ وہ دورانِ انقلاب بھی یہیں رہے لیکن ۱۴ر ستمبر کے قریب جب کہ دلّی پر انگریزوں کو فتح حاصل ہوگئی، وہ یقیناً دلّی سے جا چکے تھے۔ ۱۴ر ستمبر سے کچھ پہلے تک جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ غالبؔ قلعے کے وفادار تھے۔ اُنھوں نے ۱۱ر اگست ۱۸۵۷ء کو ظفر کی مدح میں قصیدہ پڑھا تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک طرف تو وہ قلعے میں ظفر کی مدح کریں اور گھر آ کر روزنامچے میں ان کے خلاف زہر اُگلیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کا انگریزوں سے کسی طرح کا بھی واسطہ رہا تھا، وہ ہندوستانیوں کی نظر میں مشتبہ تھے۔ دلّی میں یہ منظر عام تھا کہ جس پر انگریز سے وفاداری کا شبہہ ہوا، وہ قتل کر دیا گیا اور اس کے گھر بار کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ غالب انگریزوں کے پنشن دار تھے اور حکیم احسن اللہ خاں (جنھیں انگریزوں کا طرف دار سمجھا جاتا تھا) اُن کے مربّی تھے، اس لیے غالبؔ جیسے سمجھ دار آدمی سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے گھر میں کوئی ایسی تحریر رکھے گا، جس سے انگریزوں سے وفاداری ثابت ہوتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۴ر ستمبر (فتحِ دہلی) سے پہلے غالبؔ 'دستنبو' نہیں لکھ سکتے تھے اور اس تاریخ کے بعد مجروح دلّی میں نہیں رہ سکتے تھے۔ غالبؔ نے جس تحریر کا ذکر کیا ہے، وہ یقیناً کوئی اور چیز ہے۔ ممکن ہے کہ 'قاطعِ برہان' ہو۔ غالب کا یہ دعویٰ بھی مجھے درست نہیں معلوم ہوتا کہ 'برہانِ قاطع' پر حاشیے اُنھوں نے دورانِ انقلاب لکھے تھے۔ غالب نے ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء کے خط میں یہ بھی لکھا ہے:

''چالیس صفحے لکھ چکا ہوں، اتمام میں انتظار یہی ہے کہ پنشن کا مقدمہ طے ہو چکے، ملے یا جواب ملے اور میں بہرحال کسی جگہ اقامت گزیں ہولوں۔''[۱۱]

اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ 'دستنبو' نہ صرف معذرت نامہ[۱۲] تھی بلکہ پنشن سے بھی متعلق تھی۔ غالبؔ کو امید تھی کہ انھیں پنشن بہرحال مل جائے گی۔ وہ 'دستنبو' کے ذریعے سے خلعت اور نمبر کی کوشش کرنا چاہتے تھے۔ اوائلِ اگست ۱۸۵۸ء تک پنشن کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ البتہ ۷/اگست کو بات کچھ آگے بڑھی جس کا ذکر غالبؔ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''پنشن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی، اس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتے کے دن، ساتویں اگست کی، مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر (ڈپٹی کمشنر) نے بلایا۔ کچھ سہل سوال مجھ سے کیے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے۔''[۱۳]

اس لیے غالبؔ نے سوچا کہ 'دستنبو' ختم کر کے اسے حصولِ مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ وہ اس واقعے کے دوسرے ہی دن یعنی ۸/اگست ۱۸۵۸ء کو میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

''صاحب! ہم نے گھبرا کر اس تحریر کو تمام کیا، دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔''[۱۴]

۷/اگست کو غالبؔ نے 'دستنبو' مکمل کی ہے اور اس کے اگلے ہی دن یعنی ۸/اگست کو اس کے شائع کرانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ ۸/اگست کو ایک خط میں 'دستنبو' کی تفصیل بیان کر کے غالبؔ نے تفتہ کو لکھا ہے:

''اگر آگرے میں اس کا چھاپا ہو سکے، مجھ کو اطلاع کرو۔ اس تہی دستی اور بینوائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہوں۔ لیکن صاحب مطبع اتنے پر کیوں مانے گا اور البتہ چاہیے اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔''[۱۵]

آخر غالبؔ کی کوشش بارآور ہوئی اور 'دستنبو' کے چھپنے کا انتظام ہو گیا۔ اس کی تفصیل غالبؔ نے میر مہدی مجروح کو ان الفاظ میں لکھی ہے:

''منشی امراؤ سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ اُنھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمّے لے لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔۔ پچاس جلدیں منشی اُمید سنگھ نے لیں، پچیّس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیے۔''[۱۶]

اگرچہ غالبؔ نے متعدد مقامات پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ 'دستنبو' ان کا روزنامچہ ہے جسے وہ آغازِ انقلاب سے لکھ رہے تھے مگر 'دستنبو' میں بہت سی اندرونی شہادتیں موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ روزنامچہ ہرگز نہیں۔ غالبؔ نے اسے صرف چند دن میں لکھا ہے۔ 'دستنبو' میں انگریزوں کی مدح و ستائش ان الفاظ میں کی گئی ہے:

از خوانِ این جہانستانان نان یافتہ ام

جہاندارانِ داد آموز، دانش اندوز، نکوخوے، نکونام (ص ۶۔۷)

آزادان و نیک نہاداں (ص ۳۳)

شیر مردان (ص ۱۱)

ہزبرانِ خشمگیں (ص ۱۵)

کشورکشایان (ص ۱۷)

اس کے برعکس ہندوستانی سپاہیوں کو برا بھلا کہنے، بلکہ گالیاں تک دینے میں اُنھوں نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھا۔ مثلاً

سپاہ کینہ خواہ (ص ۶)

بے آزرم و شر انگیز (ص ۶)

کور مکان (ص ۷)

زشت سرشت (ص ۱۵)

آوارۂ چند و بیچارۂ چند (ص ۱۵)

روسیاہانِ گم کردہ (ص ۱۶)

گرازان (ص ۱۶)

بدان و بدگہران (ص ۳۳)

......کہ گردن (سپاہیانِ ہند) از فرماندہان (انگریز) پیچید، سرش درخور کفش است (ص ۳۵۔۳۶)

اس سب کے علاوہ غالبؔ نے انقلاب کی تاریخ ''رستخیزِ بیجا'' سے نکالی ہے۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں۔ دورانِ انقلاب میں انگریزوں کی یہ مدح اور ہندوستانیوں کی اس طور پر مذمت، غالب جیسے محتاط آدمی سے ممکن نہیں تھی۔

'دستنبو' کی ابتدا خدا کی مدح سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد غالبؔ نے وفاداری اور بغاوت کا فلسفہ انتہائی مضحکہ خیز انداز میں بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی فوج نے اپنے آقاؤں اور سرداروں یعنی انگریزوں سے بغاوت کر کے نادانی اور کمینہ پن کا ثبوت دیا ہے۔ 'دستنبو' کی یہ تمہید صحیح معنوں میں ایک نثری قصیدہ ہے جس میں اُنھوں نے انگریزوں کی عظمت، شان و شوکت اور انصاف پسندی کے گیت گائے ہیں۔ اس کے بعد قلعے سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اگرچہ میں بادشاہ کا ملازم تھا لیکن بوڑھا اور ضعیف ہونے کی وجہ سے تقریباً گوشہ گیر رہا۔ بہرا ہونے کی وجہ سے اہلِ محفل کے دلوں پر بوجھ بن جاتا۔ اگر محفل میں کوئی شخص کچھ کہتا تو میں اس کے ہونٹوں کو بغور دیکھتا رہتا تا کہ اس کی بات سمجھ سکوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو مرتبہ قلعے جاتا تھا۔ اگر بادشاہ محل سے تشریف لے آتے تو کچھ دیر حاضر رہ کر واپس آجاتا اور اس مدّت میں جتنی تاریخ لکھی ہوتی، اسے اپنے ساتھ لے جاتا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا۔ [۱۷]

اس طرح غالبؔ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرا قلعے کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہفتے میں ایک دو دفعہ مجبوراً قلعے جاتا تھا۔ بہرا ہونے کی وجہ سے کسی کی بات بھی نہیں سن سکتا

تھا۔ یہاں تک غالبؔ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا روزنامچے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ اس سے ان کا مقصد ضرور واضح ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد غالبؔ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کا ذکر کرتے ہیں کہ میرٹھ سے ہندوستانی سپاہی دلّی پہنچے اور اُنھوں نے انگریزوں کا قتل شروع کر دیا۔ یہاں غالب نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اس بغاوت کے خلاف تھے، وہ گھروں میں بیٹھے رہے اور انھیں میں غالبؔ بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ غالبؔ کی مصلحت ہے، ورنہ وہ قلعے میں برابر جاتے رہتے تھے) پھر غالب نے انگریزوں کے بے رحمی سے قتل ہونے پر اظہارِ افسوس اور ہندوستانی باغیوں کی یہ کہہ کر مذمّت کی ہے کہ اُنھوں نے جنگ کے طریقے تو انگریزوں سے سیکھے، اسلحہ ان سے حاصل کیا اور پھر اپنے استادوں اور مالکوں ہی کی جان کے درپے ہو گئے۔ اسی سلسلے میں غالب نے یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ یہ تو گویا غنڈے اور ذلیل لوگ تھے، جنھوں نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اُٹھائے، ورنہ شرفا تو انگریز کے ساتھ تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کو نذرِ آتش کیے جانے کا واقعہ بیان کر کے غالبؔ نے نواب یوسف علی خاں کی انگریزوں سے وفاداری اور فرخ آباد کے تفضّل حسین، بریلی کے خاں بہادر خاں اور لکھنؤ کے شرف الدولہ کی ظفرؔ سے وفاداری کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد ۱۴ر ستمبر کا مختصر سا ذکر کیا ہے، جب انگریزی فوجیں دلّی میں داخل ہوئی تھیں اور اس پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ غصّے سے بپھرے ہوئے شیروں (انگریز) نے بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور ان کے گھربار جلانا شروع کر دیے۔ غالبؔ انگریزوں کے ظلم و استبداد کو یہ کہہ کر جائز قرار دیتے ہیں کہ لڑائی کے بعد فاتح ایسا ہی کرتے ہیں۔ پھر غالب نے اپنے حالات اور مشکلات بیان کر کے اپنے مختصر سوانح بیان کیے ہیں جس میں مرزا یوسف کا ذکر بھی شامل ہے۔ اس کے بعد وہ انگریزی فوجوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انھیں حکم ہے کہ جو شخص مطیع ہو جائے، اس کا صرف مال چھین لیا جائے اور جو مطیع نہ ہو، مال کے ساتھ اس کی جان بھی لے لی جائے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ بے گناہوں کو قتل کیا گیا ہو، اور بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو ہاتھ نہیں لگایا گیا [۱۸] پھر مرزا یوسف کی وفات کی خبر دے کر حاکمانِ جھجھر، فرخ نگر، بہادر گڑھ اور بلب گڑھ کی گرفتاری اور ان کے قتل کی اطلاع دی ہے۔ یہاں تک دستنبو میں جو کچھ کہا گیا ہے، اسے اختصار کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے:

۱- ۱۱ر مئی کے واقعات سے متاثر ہو کر غالبؔ گوشہ نشین ہو گئے۔

۲- بے گناہ انگریز مردوں، عورتوں اور بچّوں کا قتل ہوا۔

۳- جن ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں سے فوجی تربیت پائی تھی اور فوجی ساز و سامان حاصل کیا تھا، وہی اپنے آقاؤں اور استادوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

۴- شرفا تباہ و برباد ہوئے۔ ذلیلوں اور کم رتبہ لوگوں (ہندوستانی سپاہیوں) کی بن آئی۔

۵- انگریزی انتظام کا تباہ ہونا، خدا کی ودیعت کی ہوئی نعمت کا درہم برہم ہونا تھا۔

۶- بادشاہ اس قابل نہیں تھا کہ باغیوں کو نکال سکے۔

۷- باغیوں نے حکیم احسن اللہ خاں کا مکان لوٹ کر آگ لگا دی۔

۸- ہندوستانی فوج میں تقریباً پچاس ہزار سپاہی تھے۔

۹- فرخ آباد کے سردار تفضل حسین خاں نے بہادر شاہ ظفرؔ کے نام ایک خط میں خود کو نیاز مندِ قدیم لکھا۔

۱۰- بریلی کے خان بہادر خان نے ایک سو ایک اشرفیاں، نقرئی ساز و سامان، آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہِ شاہی میں تحفتہً بھیجا۔

۱۱- رام پور کے نواب یوسف علی خاں نے جو انگریزوں کے وفادار ہیں، ہندوستانی سپاہیوں کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آئیں۔

۱۲- لکھنؤ میں بغاوت ہو گئی (۵ر جولائی ۱۸۵۷ء) شرف الدولہ نے واجد علی شاہ کے لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا۔

چار مہینے کا یہ عرصہ تاریخی اعتبار سے اہم ترین زمانہ ہے۔ غالبؔ اس دوران میں قلعے جاتے رہے تھے۔ ممکن نہیں کہ انھیں اگر تمام نہیں تو بیشتر حالات کا علم نہ ہوا ہو۔ لیکن چوں کہ یہ دور انگریزوں کی شکست اور رسوائی کا دور تھا، اس لیے غالبؔ اُس زمانے کے صرف چند غیر اہم سے واقعات بیان کرتے ہیں۔ غالبؔ نے یہ واقعات بہت عرصے بعد قلم بند کیے ہیں، اس لیے تاریخیں دینے سے معذور ہیں۔ مثلاً غالبؔ بتا سکتے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں کا مکان کس تاریخ کو جلا۔ فرخ آباد کے نواب تفضل حسین خاں نے کون سی تاریخ کو بہادر شاہ ظفرؔ کو خط لکھ کر ان سے اپنی نیاز مندی کا اظہار کیا۔ بریلی کے سردار خان بہادر خان نے کب اپنا تحفہ بہادر شاہ ظفرؔ کی خدمت میں بھیجا۔ اسی

طرح واجد علی شاہ کا بیٹا کب مسند نشین کیا گیا۔ چوں کہ 'دستنبو' روزنامچے کی طرح نہیں لکھی گئی بلکہ واقعات گزرنے کے بہت دن بعد چند روز میں لکھی گئی، اس لیے ان کے ہاں کئی واقعات کی ترتیب بھی غلط ہے۔ مثلاً غالب نے پہلے حکیم احسن اللہ خاں کے سازوسامان لٹنے اور ان کے گھر میں آگ لگنے کا واقعہ لکھا ہے اور اس کے بعد خان بہادر خان کا ذکر کیا ہے اور پھر واجد علی شاہ کے

بیٹے برجیس قدر کی مسند نشینی کا واقعہ قلم بند کیا ہے۔ یہ ترتیب صریحاً غلط ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کا مکان ۱۸/اگست ۱۸۵۷ء کو جلایا گیا۔[۱۹] خان بہادر خان نے اشرفیاں ۱۱/جولائی ۱۸۵۷ء کو بھیجیں[۲۰]۔ واجد علی شاہ کے بیٹے کو شرف الدولہ نے ۵/جولائی ۱۸۵۷ء کو مسند نشین کیا۔[۲۱]

اس کے بعد غالب نے ۱۴/ستمبر کو دہلی میں انگریزوں کے دوبارہ داخل ہونے اور ۱۸/ستمبر کو مکمل فتح پانے کا مختصر حال لکھ کر اپنی روداد بیان کی ہے۔ یعنی جب دہلی میں لوٹ مار ہو رہی تھی تو کس طرح غالب اور ان کے اہلِ محلّہ نے گلی کا دروازہ بند کر کے پتھر کی دیوار چنی یا پھر کس طرح مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے ان کی رکھوالی کی! یا دلّی میں پانی اور غلّے کا قحط کس طرح پڑا! غالب نے 'دستنبو' کے شروع میں لکھا تھا کہ میں نے بچپن سے انگریزوں کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے۔ یہاں اسی اجمال کی تفصیل بیان کی ہے۔ یعنی اپنے چچا نصراللہ بیگ خاں کی انگریزی فوج میں ملازمت اور ان کا انتقال اور چچا کی جاگیر سے پنشن مقرر ہونے کا حال لکھا ہے۔ اس کے بعد اپنے بھائی میرزا یوسف کے کچھ حالات بیان کر کے، اُس قصیدے کی تفصیلات بیان کی ہیں، جو غالب نے ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں کہا تھا۔ اس ضمن میں غالب نے اپنے تین مطالبات کا بھی ذکر کیا ہے۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ملکۂ معظمہ غالب کو خطاب دیں، دوسرے، خلعت دیں، تیسرے پنشن میں اضافہ کریں۔ اس کے بعد غالب نے ۳۱/ستمبر کو مرزا یوسف کا گھر لٹنے کی داستان بیان کی ہے۔ یہاں تک غالب نے صرف چار تاریخیں لکھی ہیں۔ یعنی ۱۱/مئی (جب بغاوت شروع ہوئی) ۱۴/ستمبر (جب انگریز دوبارہ دہلی میں داخل ہوئے) ۱۸/ستمبر (جب انگریزوں کو دلّی پر کامل فتح حاصل ہوئی) اور ۳۱/ستمبر (جب مرزا یوسف کا گھر لٹا) ان میں ابتدائی تین تاریخیں وہ ہیں جو ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ چوتھی، خود غالب کی زندگی سے متعلق تھی۔ دراصل ان تمام صفحات میں غالب نے کوئی خاص بات نہیں کہی۔ اگر وہ واقعی روزنامچہ لکھتے تو قلعے کے تمام واقعات کو اس طرح نظر انداز نہ کر دیتے۔ انگریزوں کے نقطۂ نظر سے ان واقعات کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا جا سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اوّل تو غالب کو تاریخیں یاد نہیں تھیں اور دوسرے، وہ عمداً قلعے کے واقعات بیان کرنے سے گریز کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ چوں کہ اس دوران میں قلعے سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا، اس لیے انھیں دو تین مشہور واقعات کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہے۔ 'دستنبو' روزنامچہ ہرگز نہیں

ہے۔اس سلسلے میں یہ دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں:

۱- غالبؔ نے واقعات کی تاریخی ترتیب غلط دی ہے جس کا تفصیلی ذکر کیا جاچکا ہے۔

۲- غالبؔ نے ۱۸ر ستمبر کو ہجری تاریخ ۲۶ محرم بتائی ہے جو غلط ہے۔

۳- مرزا یوسف کا گھر لٹنے کی تاریخ ۳۱ر ستمبر (جمعہ) لکھی ہے جب کہ ستمبر ۳۰ کا مہینہ ہوتا ہے اور یہ تاریخ ۳۰ر ستمبر ہی ہے کیوں کہ جمعہ اسی دن پڑتا ہے۔

۴- ۱۷ر مارچ ۱۸۵۷ء کو بدھ کا دن لکھا ہے جو ٹھیک ہے۔لیکن چند سطروں کے بعد ۱۸ر مارچ کو جمعہ لکھا ہے جو غلط ہے۔ظاہر ہے کہ یہ جمعرات کا دن ہے۔غالبؔ کے قلم سے اس طرح اور بھی کئی سہو ہوئے ہیں۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ غالبؔ نے 'دستنبو' خالص فارسی زبان میں لکھی ہے۔وہ تفتہؔ کو لکھتے ہیں:

> ''التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزشِ لفظِ عربی ہے۔ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے، وہ انگریزی، عربی، ہندی، جو ہیں، لکھ دیے ہیں۔''[۲۲]

اس سلسلے میں ایک بات یہ ہے کہ خطوط اور روزنامچے مصنوعی زبان میں نہیں لکھے جاتے۔جن لوگوں نے پرتکلف اور پُرتصنع زبان میں خطوط لکھے ہیں، ادب میں بھی ان کا وہی حال ہے۔مثلاً رجب علی بیگ سرور کے خطوط اور فسانۂ عجائب کی زبان میں قطعاً فرق نہیں ہے۔غالبؔ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ دستنبو میں عربی زبان قطعاً استعمال نہ ہو۔[۲۳] ایسی عبارت لکھنے کے لیے جس مزاج اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے، روزنامچہ نگار اکثر اس سے محروم ہوتا ہے۔دراصل غالبؔ 'دستنبو' کے ذریعے انگریزوں پر اپنی فارسی دانی کا رعب بھی جمانا چاہتے تھے۔

'دستنبو' کی تصنیف کا اصلی مقصد جاننے کے لیے خطوطِ غالب کا مطالعہ بہت ضروری ہے کیوں کہ جو باتیں دستنبو میں نہیں کہی جاسکتی تھیں، وہ غالب نے اپنے خطوط میں لکھی ہیں۔چوں کہ اس 'دستنبو' میں انقلاب کے واقعات بیان کیے گئے تھے، اس لیے خیال تھا کہ صاحبانِ مطبع کو اس کے چھاپنے میں تامل ہوگا۔تفتہؔ نے غالباً ایک خط میں یہ بات غالبؔ کو لکھی۔اس کے جواب میں غالبؔ تفتہؔ کو

لکھتے ہیں:

''چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکۂ معظمہ کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہوگی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا۔''[۲۴]

غلام غوث خاں بےخبؔر کے نام ایک خط میں غالبؔ نے دستنبو کی تصنیف کا اصل مقصد بہت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ غالب نے انقلاب سے پہلے جو قصیدہ ملکۂ معظمہ کو بھیجا تھا، اس کے ساتھ خطاب، خلعت اور دربار کی نشست کے نمبر میں اضافے کی درخواست کی تھی۔ اس کا ذکر کر کے غالبؔ لکھتے ہیں:

''اب اس کتاب (دستنبو) اور دوسرے قصیدے کے جابجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔''[۲۵]

۲۰ ستمبر تک دستنبو میں ملکۂ معظمہ کی مدح میں کوئی قصیدہ شامل کرنے کا غالبؔ کو خیال نہیں تھا۔ اُنھوں نے ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں حاتم علی مہر کو 'دستنبو' کی تصحیح کتابت کے سلسلے میں ہدایات دی ہیں لیکن اس میں قصیدے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔[۲۶] خط لکھنے کے بعد غالبؔ کو خیال آیا کہ اگر اس میں قصیدہ بھی شامل کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ چناں چہ اگلے ہی دن یعنی ۲۱ ستمبر کو حاتم علی مہؔر کو لکھتے ہیں:

''میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے۔ ''تہنیتِ فتح اور عمل داری شاہی''، ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذ مذہّب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے، یعنی چھاپا ہوئی ہے۔ اگر یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔''[۲۷]

غالبؔ نے تقریباً یہی بات ۲۲ر ستمبر کو منشی نبی بخش حقیرؔ کو بھی لکھی ہے۔ ۲۸ اگر چہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ اُنھوں نے یہ قصیدہ انھیں دنوں میں کہا تھا۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ مالک رام صاحب نے ثابت کیا ہے کہ اصل میں یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں کہا گیا تھا۔ بعد میں اسے تھوڑی سی ترمیم و تنسیخ کے ساتھ ملکۂ معظمہ کی مدح میں کر دیا گیا۔ لطف یہ ہے کہ غالبؔ نے اپنے عزیز ترین دوستوں سے بھی یہ حقیقت چھپائی ہے۔ اس قصیدے کے بارے میں مالک رام صاحب لکھتے ہیں:

"کلیاتِ مطبوعہ میں اس کا عنوان ہے۔" سی ام قصیدہ در مدح شہنشاہِ انگلستان"، علی گڑھ والے مخطوطے میں اس کا عنوان یہ ہے" در تہنیتِ غسلِ صحتِ حضورِ اقدس" اس قصیدے کا مطلع ہے:

در روزگار ہا نتواند شمار یافت

خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

بہادر شاہ ظفر ۱۸۵۳ء میں بہت بیمار ہو گئے تھے اور بہت دن تک بیمار رہے تھے۔ اس بیماری کے بعد غسلِ صحت کے موقع پر غالبؔ نے قصیدہ کہا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ وہی قصیدہ ہو۔ چوں کہ اولاً یہ قصیدہ غسلِ صحت کے موضوع سے متعلق تھا، اس لیے جب غالبؔ نے اسے ملکۂ وکٹوریہ سے منسوب کیا تو بعض لفظی تغیرّ و تبدّل کے علاوہ، اس میں سے وہ شعر بھی نکال ڈالے، جن میں بادشاہ کی علالت اور صحت یابی کی طرف اشارہ تھا۔" ۲۹

غالبؔ بہت ہی محتاط قسم کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے نواب رام پور کو ۸ر مارچ ۱۸۵۷ء اور یکم اپریل ۱۸۵۷ء کو دو خط لکھے تھے، ان دونوں خطوں کے لفافے دارالانشا رام پور میں محفوظ ہیں۔ ۳۰ لیکن خط چاک کر دیے گئے ہیں۔ نواب رام پور کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب کی فرمایش پر یہ خطوط چاک کیے گئے تھے۔ ۳۱ محققین کا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی تیاریاں کافی پہلے شروع ہو گئی تھیں۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں غالباً انھیں تیاریوں کے سلسلے میں کچھ لکھا ہوگا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر چہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بے چینی ضرور عام تھی۔ لیکن انقلاب کی تیاری کبھی نہیں ہوئی۔ اس کی ابتدا اچانک ہوئی۔ اس سلسلے میں ایک دلیل

یہ بھی ہے کہ کیسے ممکن تھا کہ غالبؔ کو تو ان تیاریوں کے بارے میں علم ہو گیا لیکن قلعے میں بیٹھے ہوئے خود انگریزوں کے وفادار دوستوں مثلاً نواب زینت محل اور حکیم احسن اللہ خاں تک کو کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی پتا چل گیا ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ انگریزوں کو اس کی اطلاع نہ دے دیتے اور پھر انگریز اس کا سدِ باب نہ کر لیتے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ غالب نے ۱۸۵۷ء کے معروف انقلاب کے بارے میں نہیں بلکہ غالباً نواب واجد علی شاہ کی

معزولی اور ریاست اودھ کے الحاق پر غم و غصہ کا اظہار کیا ہوگا۔ یاد رہے کہ ایک ہی مہینے پہلے واجد علی شاہ نے غالبؔ کا پانچ سو روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ میرے اس قیاس کی بنیاد اس خط پر ہے جو غالب نے تقریباً انھیں ایام میں (۲۳؍فروری ۱۸۵۷ء) کو غالب نے میر غلام حسین قدر بلگرامی کو لکھا تھا:

> ''آپ ملاحظہ فرمائیں۔ ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے اور کسی کی فیض رسانی اور قدر دانی کو کیا روئیں، اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں۔ تباہیِ ریاستِ اودھ نے باآنکہ بیگانۂ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے۔ وہ اہلِ ہند، جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔'' [۳۲]

اس لیے میرا خیال ہے کہ چوں کہ غالبؔ نے نواب رام پور کے نام خطوں میں اودھ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس لیے انھیں چاک کر دینے کی فرمائش کی۔

انقلاب کے بعد جب غالبؔ نے دوستوں اور شاگردوں کو خط لکھنا شروع کیا تو ابتدا میں اچھی خاصی احتیاط سے کام لیا۔ انقلاب کے بعد ان کا پہلا دستیاب خط ۵؍دسمبر ۱۸۵۷ء کا ملتا ہے جو اُنھوں نے مرزا ہر گوپال تفتہؔ کو لکھا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

> ''مفصّل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدّت ہے۔ باز پُرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔'' [۳۳]

غالبؔ نے کئی خطوط میں اس خوف کا اظہار کیا ہے۔ [۳۴] اگر ذاتی خطوں میں اُن کا یہ رویّہ ہے تو 'دستنبو' جو انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے لکھی گئی تھی، اس میں کیا کیا احتیاط نہ کی گئی ہو گی! یہاں کچھ ایسی احتیاطوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دلّی پر فتح کے بعد

انگریزوں نے جو قتلِ عام کیا تھا، اس کے آگے نادر شاہ کی گردن بھی شرم سے جھک جاتی مگر غالب انھیں انگریزوں کی بربریّت اور وحشیانہ حرکتوں پر یہ کہہ کر پردہ ڈالتے ہیں:

''دانم کہ دریں تاخت فرمانِ ہمہ آنست کہ ہر کہ گردن نہد، از سر خوش درگزرند و اندوختہ ببرند، دہر کہ چیرہ شود، درنوردِ سرمایہ ستانی جانش نیز شکرند۔ ہر آینہ بر کشتگان گمان میرود کہ گردن کشیدہ اند، تا سر بر دوش ندیدہ اند...... کشتنِ پیران وکودکان وزنان روا نداشتہ اند...... و بر اندامِ زنان وکودکان تارِ مومی نیاز زرند۔'' [۳۵]

غالب نے 'دستنبو' میں لکھا ہے کہ ۱۹/اکتوبر کو میرزا یوسف (غالب کے چھوٹے بھائی) پانچ دن بخار میں مبتلا رہ کر وفات پا گئے۔ [۳۶] اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرزا یوسف طبعی موت نہیں مرے تھے بلکہ کسی انگریز کی گولی کا نشانہ بنے تھے۔ اس سلسلے میں دو شہادتیں موجود ہیں۔ معین الدین حسن خاں نے مٹکاف کی فرمائش پر ۱۸۵۷ء کے حالات 'خدنگِ غدر' کے نام سے لکھے تھے۔ اُنھوں نے مرزا یوسف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''محلّہ کھڑکی فراش خانہ میں مولوی فریدالدین صبح کی نماز پڑھتے ہوئے مسجد میں مارے گئے۔ حکیم رضی الدین اور حکیم احمد حسین خاں بھی اسی طرح مع اپنے قاتلوں کے ملکِ عدم کو دست و گریباں روانہ ہوئے۔ مرزا یوسف برادرِ خورد اسداللہ خاں غالب کہ قدیم سے مجنوں تھے۔ حالتِ جنون میں گھر سے باہر نکل کے ٹہلنے لگے، وہ بھی مارے گئے اور کئی آدمی آبرودار نامی اس ہنگامۂ جرنیلی میں معرضِ قتل میں آ گئے۔'' [۳۷]

حمید احمد خاں نے لوہارو خاندان کی ایک خاتون بگا بیگم (مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو اور مرزا باقر علی خاں کامل کی بیوی) کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یوسف مرزا سڑک کی گلی میں مارے گئے تھے۔ [۳۸] مالک رام صاحب اور قاضی عبدالودود صاحب دونوں نے اس بیان سے اتفاق کیا ہے۔ [۳۹] دراصل غالب یہ حقیقت اس لیے چھپانا چاہتے تھے کہ کہیں اس سے ان کی انگریز سے وفاداری مشتبہ نہ ہو جائے۔ بقول ''معین الدین حسن خاں، ''حکیم رضی الدین اور حکیم احمد حسین خاں بھی...... مع اپنے قاتلوں کے ملکِ عدم کو دست و گریباں روانہ ہوئے۔'' جس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں لڑتے ہوئے مارے گئے تھے اور اُنھوں نے بھی کچھ انگریزوں کو مارا ہوگا۔ میرزا یوسف مجنوں تھے اور ان کا انگریزوں سے لڑنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ لیکن بہر حال غالب کو

یہ ڈر تھا کہ کہیں ایں ہم بچۂ شتر است کے مصداق مرزا یوسف کا شمار بھی انقلابیوں میں نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں غالب کے مستقبل پر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا۔

غالب نے 'دستنبو' میں حکیم احسن اللہ خاں کی جتنی تعریف کی ہے، اتنی کسی اور کی نہیں کی۔ غالب کو یقین تھا کہ انگریز حکیم صاحب سے بہت خوش ہیں، اس لیے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ان کے غالب سے بہت اچھے تعلقات ہیں تو اس کا ان کے معاملات پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ یہ اور بات

ہے کہ بعد کو حکیم صاحب بھی معتوب ہو گئے۔ اگر یہ واقعہ 'دستنبو' کی تصنیف سے پہلے ہو گیا ہوتا تو یقین ہے کہ غالب ان کا نام تک نہیں لیتے۔ [۴۰]

حکیم احسن اللہ خاں کا بہادر شاہ ظفر کے عہد کے اہم ترین اشخاص میں شمار ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہاں حکیم صاحب کے کچھ حالات بیان کر دیے جائیں۔

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے حکیم احسن اللہ خاں پر ایک بہت اچھا مقالہ لکھا ہے جو انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہونے والے 'اردو ادب' کے جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ حکیم احسن اللہ خاں کے بارے میں یہ معلومات اسی مقالے سے لی گئی ہیں۔ پروفیسر ظل الرحمٰن نے لکھا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں نے باقاعدگی سے علمِ طب حاصل کیا تھا۔ ابتدا میں وہ نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکہ کے ملازم ہوئے۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد حکیم احسن اللہ خاں، فیض احمد خاں والیِ جھجر کے معالجِ خاص مقرر ہو گئے۔ ریاست جھجر کی ملازمت کے بعد حکیم صاحب شاہی طبیب کے منصب پر فائز ہوئے اور اُنھیں دربارِ شاہی سے خلعت اور عمدۃ الملک حاذق الزماں کے خطاب سے نوازا گیا۔ بعد میں وہ بہادر شاہ ظفر کے طبیب خاص کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۴۰ء میں اُنھیں خلعت چھ پارچے تین رقم جواہر مع خطابات احترام الدولہ عمدۃ الملک معتمد الملک ثابت جنگ سے نوازا گیا۔

حکیم صاحب بڑے دانش مند اور صاحبِ تدبیر سیاست داں تھے، اس لیے اُنھیں مغل حکومت کے وزیرِ اعظم کے مشیرِ خاص کے عہدے پر بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں اُنھیں کی سفارش سے غالب، بہادر شاہ ظفر کے دربار میں تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے۔ حکیم صاحب کے غالب سے بہت گہرے مراسم تھے۔

حکیم صاحب چوں کہ ایک دانش مند تھے اور غیر معمولی طور پر دور اندیش تھے، اس لیے اُنھیں یقین تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شاہی فوج کو فتح حاصل نہیں ہو سکے گی۔ بجائے خاموش رہنے کے ہمیں

افسوس ہے کہ اُن کی ہمدردیاں برطانوی حکومت کے ساتھ ہوگئیں اور وہ برطانیہ کے خیر خواہ اور طرف دار بن گئے۔ انقلابیوں کو جب اس حقیقت کا پتا چلا تو وہ حکیم صاحب کو قتل کرنے کے درپے ہوگئے۔ ایک دن لال قلعے کے اندر انقلابیوں نے حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ چوں کہ بہادر شاہ ظفرؔ کو اُن سے بہت عقیدت اور محبت تھی، اس لیے اُنھوں نے بیچ میں پڑ کر اُن کو بچالیا۔

اسلم پرویز نے اپنی کتاب 'بہادر شاہ ظفر' میں لکھا ہے:

> ''حکیم احسن اللہ خاں کو بہادر شاہ ظفرؔ آخر تک اپنا ہمدرد اور ہمراز ہی سمجھتے تھے۔ چناں چہ بغاوت کے دوران اُنھوں نے کئی بار اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر حکیم احسن اللہ خاں کی حفاظت کی۔''[41]

ایک دفعہ انقلابیوں نے حکیم صاحب کے گھر کو ایسی آگ لگائی کہ پورا گھر جل گیا۔

غالبؔ حکیم احسن اللہ خاں کو اپنا محسن کہتے ہیں۔ یہ بات اُنھوں نے تفتہؔ کے نام ایک خط مورخہ ۱۶/دسمبر ۱۸۵۸ء کو لکھی ہے۔

حکیم احسن اللہ خاں کا ستمبر ۱۸۷۳ء میں انتقال ہوگیا۔

نواب انورالدولہ سعدالدین بہادر شفقؔ کے نام ۶/اکتوبر ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں اُنھوں نے لکھا ہے:

> ''پروردگار اس بزرگ کو سلامت رکھے کہ قدر دانِ کمال بلکہ حق تو یوں ہے کہ خیرِ محض ہے۔''[42]

غالبؔ حکیم احسن اللہ خاں کے اتنے بڑے مداح تھے کہ اُنھوں نے اکثر خطوط میں اُن کا ذکر کیا ہے۔ میں یہاں اقتباسات نقل کر رہا ہوں:

> ''تم کو مبارک ہو کہ حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) پر سے وہ سپاہی، جو اُن کے اوپر متعیّن تھا، اُٹھ گیا اور ان کو حکم ہوا کہ اپنی وضع پر رہو، مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو...... صفدر میرے پاس آیا تھا، یہ اُس کی زبانی ہے۔'' (غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

> ''جناب حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) ایک روز ازراہِ عنایت یہاں

> آئے۔ کیا کہوں کہ اُن کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا اُن کو زندہ رکھے۔"

حکیم احسن اللہ خاں کے علاوہ غالبؔ نے نواب رام پور اور مہاراجہ پٹیالہ کی بھی تعریف کی ہے اور ان سے اپنا تعلق اور انگریزوں سے ان کی وفاداری کا ذکر کیا ہے۔

پوری کتاب میں غالبؔ کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ قلعے سے اپنی بے تعلقی اور بے نیازی ثابت کریں۔ اس سلسلے کی ایک کوشش یہ بھی ہے کہ غالبؔ لکھتے ہیں کہ "میں نے بادشاہ اور شاہزادوں کے بارے میں اس لیے کچھ نہیں لکھا کہ مجھے ابھی تک ان کے بارے میں کچھ علم نہیں۔"[۴۳] یہاں غالبؔ راست گوئی سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ کیوں کہ 'دستنبو' میں یہ بات ۱۹/اکتوبر (وفات میرزا یوسف) کے بعد لکھی گئی ہے۔ بہادر شاہ ظفر ۲۱/ستمبر کو گرفتار ہوئے تھے۔ اس کے دوسرے ہی دن ہڈسن نے مرزا مغل، مرزا خضر اور ظفر کے پوتے مرزا ابوبکر کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد کئی دن تک شاہزادوں اور سلاطین کو قتل کیا جاتا رہا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ۱۹/اکتوبر کو یعنی ایک مہینے بعد تک غالبؔ کو اس کا علم نہ ہوا ہو۔ (یہ اور بات ہے کہ خود 'دستنبو' ۱۸۵۸ء میں لکھی گئی) غرض تین چار صفحے کے بعد غالبؔ نے اپنی طرف سے ثابت کر دیا کہ مجھے بادشاہ اور شہزادوں سے قطعی دل چسپی نہیں۔

منشی شیو نرائن جو 'دستنبو' چھاپ رہے تھے، اُنھوں نے کتاب کے آخر میں لکھ دیا کہ "یہ سرکار کی فتح کا حال" ہے۔ غالبؔ کو معلوم ہوا تو فوراً منشی شیو نرائن کو لکھا:

> "آخر کے صفحے کی دو سطریں از روے مضمون سراسر کتاب کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا۔ صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے۔"[۴۴]

منشی شیو نرائن نے وہی لکھا تھا جو تاثر کتاب کے مطالعے سے قائم ہوتا ہے لیکن غالبؔ کو یہ پریشانی تھی کہ سرکار کی فتح کا حال لکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ غالبؔ نے انگریزوں کی فتح کے بعد یہ کتاب لکھی ہے جب کہ وہ ثابت یہ کرنا چاہتے تھے کہ یہ ان کا روزنامچہ ہے جسے وہ اوّل روز ہی سے لکھ رہے تھے اور وہ ابتدا ہی سے انگریزوں کے ساتھ اور انقلابیوں کے خلاف تھے۔

غالبؔ نے احتیاط کی حد تو اپنے خطابات کے ساتھ کی ہے۔ انھیں یہ خطابات بہادر شاہ ظفر نے دیے تھے، جس پر انھیں بڑا فخر تھا۔ لیکن ان بدلے ہوئے حالات میں اُنھوں نے مصلحت اسی میں

دیکھی کہ 'دستنبو' پر ان کے نام کے ساتھ یہ خطابات نہ لکھے جائیں۔ چناں چہ مرزا تفتہ کو ہدایت دیتے ہیں:

''منشی شیونرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں۔ نام اور تخلص بس۔

اجزاے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں نام کے بعد لفظ بہادر اور بہادر کے بعد تخلص۔''[45]

چناں چہ 'دستنبو' کے پہلے اڈیشن پر اُن کا نام اس طرح لکھا گیا تھا:

''فردوسیِ ہند نواب اسد اللہ خاں بہادر، غالبؔ تخلص دہلوی''

لیکن جب ۱۸۶۵ء میں 'دستنبو' کا دوسرا اڈیشن لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی کے مطبع میں طبع ہوا تو اس پر ان کا نام اس طرح لکھا ملتا ہے:

''نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالبؔ عرف مرزا نوشہ''۔

حواشی

(غالبؔ، ۱۸۵۷ء اور دستنبو)

۱۔ غالبؔ کے خطوط: ۲: ۵۸۴: ص ۳۲

۲۔ اس قصیدے کا جواب آنا تو درکنار، غالبؔ نے انقلاب سے پہلے ملکۂ معظمہ جو قصیدہ بھیجا تھا وہ بھی آ گیا۔ غالبؔ نے غلام غوث خاں بے خبر کو لکھا ہے: ''لارڈ کیننگ صاحب نے بعد فتح دہلی میرا قصیدہ مجھ کو واپس بھیج دیا۔ صاحب سکرٹر نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم ایام غدر میں بادشاہِ باغی کے مصاحب رہے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے راہ و رسمِ آمیزش منظور نہیں۔'' (خطوطِ غالب، ص ۳۳۰)

۳۔ دستنبو، ص ۳۵

۴۔ ایضاً، ص ۳۵

۵۔ خطوطِ غالب، ص ص ۱۴۸۔۱۴۹

۶۔ غالبؔ نے اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں میر مہدی مجروحؔ کو لکھا ہے: ''پنشن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو لکھوں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔'' (خطوطِ غالب، ص ۲۰۰)

۷۔ خطوطِ غالب، ص ۴۶۹

۸۔ غالبؔ کی نادر تحریریں، ص ۳۴

۹۔ خطوطِ غالب، ص ۲۶۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۶۶

۱۱۔ غالبؔ کی نادر تحریریں، ص ۳۴

۱۲ اس سے پہلے کئی محققینِ غالبؔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔(خ۔ا)

۱۳ سہلِ سوال کی تفصیل غالبؔ نے حکیم غلام نجف خاں کو ان الفاظ میں لکھی ہے:

''صرف اتنا ہی پوچھا کہ غدر میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہوا، کہا گیا۔'' خطوطِ غالب، ص ۳۷۴)

۱۴ خطوطِ غالبؔ، ص ۲۶۹

۱۵ ایضاً، ص ۱۵۴

۱۶ خطوطِ غالبؔ، ۲۷۰

۱۷ حالاں کہ غالبؔ نے خود قاضی عبدالجمیل جنوںؔ کو ۲۰ر نومبر ۱۸۵۵ء کو لکھا تھا:

''صبح کو میں ہر روز قلعے جاتا ہوں...... میں اگر قلعے جاتا ہوں تو پہر دن چڑھے آتا ہوں۔'' (خطوطِ غالب، ص ۱۸۰)

۱۸ ظاہر ہے کہ غالبؔ کا یہ بیان صریحاً خلافِ حقیقت ہے۔

۱۹ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۶۲

۲۰ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۴۷

۲۱ جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء، ص ۲۷۷

۲۲ خطوطِ غالبؔ، ص ص ۱۵۳۔۱۵۴

۲۳ اگرچہ غالبؔ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، دستنبو کا ایک خاص نسخہ، سید جمیل الدین، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ص ۵۱۔۶۱

۲۴ خطوطِ غالبؔ ص ص ۱۵۴۔۱۵۵

۲۵ ایضاً، ص ۳۲۶

۲۶ خطوطِ غالبؔ، ص ۱۰۳۰

۲۷ ایضاً، ص ۲۱۵۔۲۱۶

۲۸ ایضاً، ص ۲۶۱

۲۹۔ مالک رام، غالبؔ کے فارسی قصیدے، نقوش، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۲۳

۳۰۔ مکاتیب غالبؔ، ص ۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۲۱ (حواشی)

۳۲۔ خطوطِ غالبؔ، ص ۱۴۴

۳۳۔ خطوطِ غالبؔ (مرتبہ مالک رام)، ص ۳۴

۳۴۔ مثلاً ''زیادہ اس سے نہ تم لکھوگے، نہ میں لکھوں گا۔ بنام غلام نجف خاں۔ ۲۱؍دسمبر ۱۸۵۷ء۔ خطوطِ غالب، ص ۳۷۰) (یہاں کا) حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ بنام شہاب الدین خاں۔ ۸؍فروری ۱۸۵۸ء (خطوطِ غالب، ص ۱۰۶) قلم ہاتھ میں لیے، پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے، ورنہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بنام حکیم غلام نجف خاں، ۱۹؍جنوری ۱۸۵۸ء، (خطوطِ غالبؔ، ص ۳۷۰)

۳۵۔ دستنبو، ص ۲۳۔۲۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۷

۳۷۔ خدنگِ غدر، ۱۴، الف، بحوالہ صحیفہ، غالبؔ نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۱

۳۸۔ احوالِ غالبؔ، ص ۸۷

۳۹۔ نوائے ادب (اپریل ۱۹۵۹ء)، ص ۱۱

۴۰۔ ہوا بھی یہی۔ انگریزوں نے حکیم احسن اللہ خاں پر پہرہ بٹھا دیا تھا۔ جب وہ پہرہ اُٹھا تو غالبؔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں۔ ''تم کو مبارک ہو حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جو اُن پر متعین تھا، اُٹھ گیا۔ جی ان کو دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از روئے احتیاط جا نہیں سکتا۔'' (خطوطِ غالب، مہر، ص ۶۹)

۴۱۔ بہادر شاہ ظفر: ص ۲۶۷

۴۲۔ غالب کے خطوط: ۳: ۱۹۷۹

۴۳۔ دستنبو، ص ۳۱

۴۴۔ خطوطِ غالبؔ، ص ۲۳۷

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۵۹

غالبؔ کی اردو نظم و نثر

(قلعے سے متعلق)

کسی بھی فن کار کی تخلیقی قوتیں عام طور پر پچاس برس کی عمر کے بعد سلب ہونی شروع ہوجاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ فنی سطح پر ہئیت اور اسلوب میں کچھ اور نکھار پیدا ہوجائے لیکن جہاں تک تخلیقی عمل کا تعلق ہے، جس میں فکر، احساس اور جذبہ شامل ہے، وہاں فن کار اُس مقام پر پہنچنے کے بعد زیادہ تر خود کو دہرانے لگتا ہے۔ اس کا اصل سبب کیا ہے، اس پر تو ماہرینِ نفسیات ہی بہتر طریقے سے روشنی ڈال سکتے ہیں لیکن عام خیال یہی ہے کہ پچاس کے بعد چوں کہ فنکار کے قوئ مضمحل ہونے لگتے ہیں، اس لیے جذبے اور احساس میں وہ پہلی سی شدّت باقی نہیں رہتی اور فکر کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ تاہم اس عمر میں عقلیت اور قوتِ استدلال بڑھ جاتی ہے۔ فکر و خیال میں منطقی پہلو زیادہ اُجاگر ہونے لگتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فن کار جوش اور ولولے سے محروم ہوجاتا ہے۔ غالبؔ نے اپنی اس کیفیت کا اظہار نظم اور نثر دونوں میں کیا ہے۔[1]

اسی مفہوم کا اُن کا ایک شعر ہے:

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے، ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے[1]

یہی بات نثری پیرائے میں اپنے ایک خط میں غالبؔ نے چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام ان الفاظ میں کہی ہے:

"کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری

ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ میں نے کیوں کر لکھی تھی اور کیوں کہ یہ شعر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدلؔ کا مصرع گویا میری زبان سے ہے

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ''۔[۲]

عمر کے ساتھ ساتھ غالبؔ شعر گوئی سے معذور ہوتے گئے۔ ۱۸۵۲ء (اس سال غالبؔ قلعے میں ملازم ہوئے تھے) سے لے کر ۱۸۵۷ء تک غالبؔ نے جو مدحیہ قصیدے، غزلیں وغیرہ کہی تھیں، وہ ان کی مجبوری تھی۔ لیکن قلعے کی ملازمت کے دوران شعر گوئی ان کے لیے لازمی تھی۔ وہ بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں شعر کہتے، بہادر شاہ ظفرؔ اور کئی شہزادوں کے کلام پر اصلاح دیتے اور دربار میں اپنا کلام بھی پڑھتے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی فرمائش پر قلعے کے مشاعروں میں شرکت بھی کرتے۔ پر یہ سب خوشی کا سودا نہیں بلکہ اُن کی مجبوری تھی۔ ۲۵ / اکتوبر ۱۸۳۷ء کو بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ اس سے تین برس پہلے ۱۸۳۴ء میں اکبر شاہ ثانی کی مدح میں غالبؔ نے سہرے کا وہ مقطع کہا تھا جس سے غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ اور ذوقؔ کے تعلقات میں تلخی پیدا ہوئی تھی۔ اس کا تفصیلی ذکر زیرِ نظر کتاب کے شروع میں کیا جا چکا ہے۔

۱۸۵۲ء میں غالبؔ نے پہلے تو مغل شہزادے جواں بخت کی شادی پر سہرا کہا، جس کے مقطعے کی وجہ سے غالبؔ، ذوقؔ اور جواں بخت کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی اور پھر غالبؔ نے اس کشیدگی کو ختم کرنے کے لیے قطعۂ اعتذار یہ کہا جو اس کتاب میں اردو نظم و نثرِ غالبؔ کے تحت شامل ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے:

منظور ہے گزارش احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسن طبیعت نہیں مجھے

سہرے کا مقطع تھا:

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

ظاہر ہے یہ اشارہ بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی طرف تھا۔ اس کے بعد بھی غالبؔ نے شعر تو کہے لیکن بہت کم۔ ۱۸۴۷ء میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ایک قطعہ کہا تھا۔ اسی سال غالب نے تیرہ اشعار کی ایک غزل بھی کہی تھی، جس میں چار شعر بہادر شاہ ظفر کی

مدح میں تھے۔ ۱۸۵۰ء میں غالبؔ نے آٹھ اشعار کی غزل کہی جس میں بالواسطہ طور پر بہادر شاہ ظفرؔ سے خطاب تھا اور مقطعے میں یہ کہہ کر بہادر شاہ ظفرؔ کو دعا دی تھی کہ

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا

وہ دن گئے، کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

غالبؔ نے قلعے میں منعقد ہونے والے کم سے کم پانچ مشاعروں میں شرکت کی اور ہر مشاعرے میں غزل پڑھی۔ اس کے علاوہ کئی غزلیں دربار میں بہادر شاہ ظفرؔ کو سنائیں۔ ۱۸۵۳ء میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کی غزل پر ایک مخمس کہا۔ اس مخمس میں ظفرؔ کی غزل کے مطلعے کا پہلا مصرع تھا ؎

کھینچ کے قاتل، جب تری شمشیر آدھی رہ گئی

۱۸۵۳ء میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں ایک اور قطعہ کہا جس کا پہلا مصرع ہے:

اے شاہِ جہانگیرِ جہاں بخشِ جہاں دار

۱۸۵۵ء میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں ایک اور قصیدہ کہا جس کا پہلا مصرع ہے:

اے شہنشاہ آسماں اورنگ

اس کے علاوہ غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں کئی فارسی قصیدے اور اردو کے منفرد اشعار کہے۔ فارسی اور اردو نثر میں تقریظیں لکھیں۔ یہ تمام مواد اس کتاب میں 'اردو نظم ونثرِ غالبؔ' اور 'فارسی نظم ونثرِ غالبؔ' کے عنوانات کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے۔

غالبؔ کے ایسے خطوط کی تعداد خاصی ہے، جن میں غالبؔ نے کہا ہے کہ انھیں اب شعر وشاعری سے قطعی لگاؤ نہیں رہا ہے۔ مثلاً

مرزا ہر گوپال تفتہؔ کے نام ۱۲/اپریل ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا؟''[۳]

غالبؔ سے ان کے شاگرد شیونرائن آرامؔ نے فرمائش کی کہ وہ اپنا کلام انھیں بھیجیں۔ غالبؔ نے ۲۲/اپریل ۱۸۵۹ء کو جواب میں آرامؔ کو لکھا:

''میاں! تمھاری جان کی قسم، نہ میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہتا ہے نہ مجھ سے کہا جائے۔ اس دو برس میں صرف وہ پچیس تیس شعر بہ طریق قصیدہ تمھاری خاطر سے لکھ کر بھیجے تھے (ایلن برون کے بیٹے کی ولادت کو اکتیس شعری قصیدۂ اردو، جسے آرام نے غالبؔ سے لکھوا کر ایلن برون کو پیش کیا) سوائے اس کے اگر میں نے کوئی ریختہ کہا ہوگا تو گنہ گار، بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی۔ صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے؟''[۴]

چودھری عبدالغفور سرورؔ نے غالبؔ سے اُن کے کلام کی فرمائش کی تو ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالبؔ نے انھیں لکھا:

''شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد (۱۸۵۷ء) کے بعد ایک قصیدہ جو 'دستنبو' (نومبر ۱۸۵۸ء) میں ہے اور ایک قصیدہ (مارچ، اپریل ۱۸۵۹ء) نواب لفٹیننٹ بہادر غرب و شمال (جارج ایڈمنسٹن) کی مدح میں ایک اور قصیدہ (مارچ ۱۸۵۹ء) نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب (سَر رابرٹ منٹگمری) کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رُباعی، اس نظم کے سوا، اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لیجیے۔''[۵]

ایک اور خط میں شعر و شاعری ترک کرنے یا کم کرنے کے وجوہ غالبؔ نے ان دردناک الفاظ میں بیان کیے ہیں:

''صناعتِ شعر، اعضاو جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے، دماغ چاہیے، ذوق چاہیے، اُمنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایتِ فن، اس کے اسباب کہاں؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیہِ رَاجِعُون۔''[۶]

اسی موضوع پر تفتہؔ کے نام غالبؔ لکھتے ہیں:

"اشعارِ تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں۔" [۲]

ظ۔انصاری نے غالبؔ کی شعر گوئی کے بارے میں لکھا ہے:

> یہی نہیں کہ غالبؔ کا سرمایۂ علمی، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی ۱۸۵۷ء کے فتنہ وفساد کی نذر رہوا۔اس سے بھی کہیں بڑھ کر ستم یہ کہ اس غارت گری کے نتیجے میں غالبؔ کا ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہوگیا،سخن سنجی اور جوہرِ فکر کی رخشندگی جاتی رہی۔قوّتِ ناطقہ پر تصرّف باقی نہ رہا اور وہ شعر سے بیزار ہوگئے۔

غالبؔ کے قویٰ مضمحل ضرور ہو چکے تھے،لیکن ان کا دل و دماغ ابھی تک روشن تھا بلکہ کائنات کے شعور اور آگہیِ ذات نے اس روشنی کو روشن تر کر دیا تھا۔زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے فکر میں گہرائی، خیال میں بالیدگی، احساس میں اعتدال اور جذبات میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔غالبؔ شعر وشاعری تقریباً ترک کر کے اردو نثر پر آ گئے۔اُنھوں نے اردو میں خطوط ضرورتاً لکھنے شروع کیے تھے،لیکن آہستہ آہستہ مکتوب نگاری میں ان پر اظہار کے اِمکانات کے نئے نئے در باز ہوتے چلے گئے جنھوں نے بالآخر اُس فن کار کو پھر سے جگا دیا جو ردیف اور قافیے کی مشقت سے تھک کر سو گیا تھا۔

غالبؔ کے ایک محقق نے مدلل طریقے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ہم سے شاید غالبؔ کو چھین لیا تھا اور اس کے بدلے میں ہمیں غالب نثر نگار ملے۔میرا ذاتی خیال ہے کہ غالب ہم سے بہت پہلے چھن چکے تھے۔

یہ تو عام طور پر ہوتا ہے کہ فن کار مدت تک تخلیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور جب اس کا موڈ آتا ہے تو ساری کسر نکل جاتی ہے لیکن غالبؔ کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ذاتی زندگی کی ناکامی نے ان کے دل ودماغ کو اس بری طرح متاثر کیا تھا کہ ان کے تخلیقی سوتے بہت پہلے خشک ہونے لگے تھے۔

غالبؔ کی زندگی کا سب سے پہلا الم ناک واقعہ پینشن کے معاملے میں اُن کی ناکامی تھی۔غالب بہت امیدوں سے کلکتے گئے تھے۔کلکتے کے سفر اور وہاں کے قیام نے انہیں بہت مقروض کر دیا تھا۔جب جنوری ۱۸۳۱ء میں اُن کے خلاف فیصلہ ہوا تو اُن کی دنیا اندھیر ہوگئی۔اور بہ قول غالب "قرض الگ، رسوائی الگ اور مستقبل کا خوف الگ۔" اس واقعے سے غالبؔ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ انھیں شعر گوئی سے دل چسپی نہیں رہی۔بہ قول مولانا امتیاز علی خاں عرشی:

''اور پھر جنوری ۱۸۳۱ء میں مقدمہ اُن کے خلاف فیصل ہوا تو مستقبل کے خوف ناک تصور نے اُن کے دل و دماغ کو سخت اذیت پہنچائی اور پہلی بار اُن کی طبیعت نے فکرِ شعر وسخن سے تنفر کا اظہار کیا۔ اب وہ غزل کہتے تھے مگر دوستوں کے اِصرار پر اور قصائد بھی لکھتے تھے مگر مالی پریشانیوں کے بھوت کو دفع کرنے کے لیے۔''[۸]

مولوی سراج الدین احمد سے غالبؔ کی ملاقات کلکتے میں ہوئی تھی اور کلکتے سے واپسی پر اُن سے خط وکتابت ہوئی۔ مولوی صاحب کے نام غالبؔ کا ایک فارسی خط ہے جس پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مولانا عرشیؔ کا خیال ہے کہ یہ ۱۸۳۵ء یا ۱۸۳۶ء میں لکھا گیا۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

''تازہ غزل بھیجنے کے بارے میں آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ مگر دل کی خون آبہ فشانی اور فکر کی جگر کاوی کے بغیر غزل موزوں نہیں ہوتی اگر مجھے غمِ روزگار سے تھوڑی سی بھی مہلت ملتی تو پھر آپ میری فکر کے جوہر دیکھتے۔ بہر حال اس افسردگی کے باوجود جس وقت بھی کوئی شعر زبان پر آجائے گا، اُسے سپردِ قلم کر کے خدمتِ گرامی میں بھیج دوں گا۔''[۹]

۱۸۴۰ء میں جب رام پور کے نواب محمد سعید خاں تخت نشین ہوئے تو اُن کے بھائی نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ نے اس موقع کے لیے غالبؔ سے قصیدے کی فرمایش کی۔ غالبؔ اُن کے نام ایک فارسی خط میں جواب دیتے ہیں:

''لیکن کیا کروں کہ شعر گوئی کا تعلق دل سے ہے۔ جب دل ہی ٹھکانے نہ ہو تو زبانِ سخن کہاں سے ملے؟ آپ جیسے دیدہ ور صاحب دل سے بڑھ کر اس حقیقت کا شناسا اور کون ہوگا کہ شعر کہنے کے لیے دل کا یک سو ہونا ضروری ہے۔ یقین کیجیے کہ یہ دلِ صد پارہ جو میرے سینے میں ہے میرا دشمن بن گیا ہے اور اب سخن گستری اور معنی آفرینی کا اہل نہیں رہا...... امید ہے کہ اس گزارش کے بعد آپ نظم و نثر کے لحاظ سے مجھے مردہ تصور فرمائیں گے اور دعاے خیر میں یاد رکھیں گے۔'' (فارسی سے ترجمہ)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ سخن گستری اور معنی آفرینی سے متنفر ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ ذہنی اعتبار سے شعر گوئی کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالبؔ قصیدہ ضرور لکھتے، کیوں کہ اس کا پورا اِمکان تھا کہ غالبؔ کو اس قصیدے پر انعام ملتا۔ یہ خیال رکھیے کہ اس وقت غالبؔ کی عمر

تقریباً ۴۳ سال ہے اور ابھی ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں سترہ سال باقی ہیں۔

غالبؔ کے اردو دیوان کا پہلا اڈیشن ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا اس میں اشعار کی تعداد ۱۰۹۵ تھی۔ دوسرا اڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تو یہ تعداد ۱۱۱۱ ہوگئی گویا چھ سال میں کم وبیش سولہ شعر کا اضافہ ہوا۔ تیسرا اڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تو اس میں اشعار کی تعداد ۱۷۹۶ء ہوگئی اور چوتھا اور غالبؔ کی زندگی کا آخری اڈیشن ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تو یہ تعداد ۱۸۰۲ء ہوگئی۔ ممکن ہے کہ غالبؔ نے زیادہ تعداد میں شعر کہے ہوں لیکن انتخاب انھیں اشعار کا کیا، پھر بھی منتخب اشعار کی تعداد سے ان اشعار کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جو اُس زمانے میں کہے ہوں گے۔

ان اعداد وشمار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان غالبؔ نے شعرگوئی تقریباً ترک کردی تھی۔ اس لیے ۱۸۴۷ء کے اڈیشن میں صرف سولہ اشعار کا اضافہ ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں غالبؔ قلعے میں ملازم ہوگئے تو بادشاہ اور شہزادوں کے اِصرار پر انھیں مجبوراً اردو میں غزلیں کہنی پڑیں۔

غالبؔ اپنی اس مجبوری کا ذکر انورالدولہ نواب سعدالدین خاں شفقؔ کے نام اس طرح کرتے ہیں:

> ''ہر چند ایک مدت سے طبیعت اردو شعر کہنے پر مائل نہیں لیکن کبھی کبھی بادشاہ کی رضاجوئی اور ملکۂ عالیہ کے فرمان کی تعمیل میں اردو میں بھی شعر کہنے پڑتے ہیں۔''

۳رجنوری ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں سید بدرالدین احمد المعروف بہ فقیر کو لکھتے ہیں:

> ''آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی۔ ہاں ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں، سو وہ یا تمھارے دوست حسین مرزا صاحب کے پاس ہوں گی یا ضیاالدین خاں صاحب کے پاس۔''[۱۰]

گویا قلعے کی ملازمت کے دوران غالبؔ نے اردو میں کچھ غزلیں کہیں اور فارسی میں شاید ایک بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ اردو کا جب تیسرا اڈیشن شائع ہوا تو اُس میں ۶۸۵ اور چوتھے اڈیشن میں مزید چھ شعر کا اضافہ ہوا۔ اگر پہلے اڈیشن کے سنہ طباعت یعنی ۱۸۴۱ء سے آخری اڈیشن کے سنہ طباعت ۱۸۶۲ء تک کہے گئے اردو اشعار کی سالانہ اوسط نکالی جائے تو غالبؔ نے اکیس سال میں کم وبیش ۷۲۷ اشعار یعنی اوسطاً چونتیس شعر فی سال کہے۔ اگر غالبؔ قلعے میں ملازم نہ ہوئے

ہوتے اور بادشاہ کی مجبوری نہ ہوتی تو ان اشعار کی تعداد غالباً اور بھی کم ہوتی۔

غرض یہ ہے کہ غالبؔ کے شعر کہنے کی صلاحیتیں بہت حد تک سلب ہو چکی تھیں اور پھر ۱۸۵۷ء کے حالات نے تو بالکل اُن کی شعری صلاحیتوں کو مُردہ کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر وفات کے

وقت تک اُنھوں نے صرف سات غزلیں، نو قطعے، چار قصیدے، ایک مرثیہ، ایک سہرا، ایک مثنوی اور تین متفرق اشعار کہے تھے اور کُل اشعار کی مجموعی تعداد دو سو اکسٹھ تھی۔

غالبؔ نظم کی بجائے نثر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ غالبؔ نے اردو میں خطوط ضرورتاً لکھنا شروع کیے تھے لیکن خطوط نویسی میں اظہار کے اِمکانات نے بہت جلد ان کے اندر چھپے ہوئے اس فنکار کو جگا دیا جو ردیف و قافیے کی مشقت سے تھک کر سو گیا تھا۔ پچاس برس کے بعد فنکار کے ذہن، جذبے اور فکر میں ہونے والی وہ تبدیلیاں جو تخلیقی عمل کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں، نثر کے اس نئے وسیع اور کشادہ میدان میں غالب کے لیے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوئیں۔

غالبؔ کی نثر نگاری کا آغاز فارسی کی 'پنج آہنگ' سے ہوا۔ یہ کتاب ۱۸۲۵ء میں مرتّب ہوئی تھی لیکن اس کے شائع ہونے کی نوبت ۱۸۴۹ء میں آئی۔ 'پنج آہنگ' کے ابتدائی دو آہنگوں میں سے غالب نے پہلے آہنگ میں القاب و آداب لکھنے کے طریقوں سے بحث کی اور دوسرے آہنگ میں بعض مصادر، مصطلحات اور فارسی الفاظ کے معنی وغیرہ بیان کیے ہیں۔ باقی تین آہنگوں میں غالبؔ کے اشعار، تقاریظ اور عباراتِ متفرقہ اور فارسی خطوط کا انتخاب شامل ہیں۔ غالبؔ کی دوسری فارسی کتاب 'مہرِ نیم روز' ہے۔ یہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ کی پہلی جلد ہے۔ دوسری جلد مکمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی وجہ سے غالبؔ تنہائی اور گوشہ گیری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ کہیں سے مولوی محمد حسین تبریزی کی مشہور لغت 'برہانِ قاطع' اور 'دساتیر' ہاتھ آ گئیں۔ زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرنے اور ذہنی اعتبار سے خود کو مصروف رکھنے کے لیے غالبؔ نے خود کو ان کتابوں کے مطالعے میں غرق کر دیا۔ 'برہانِ قاطع' کے مطالعے کے دوران انھیں محمد حسین تبریزی سے اختلاف ہوا۔ ایک دل چسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ اُنھوں نے حاشیے پر اختلافات درج کر دیے۔ اس طرح گویا غالب کے علمی کام کا آغاز ہوا۔ ابھی غالب 'برہانِ قاطع' کا مطالعہ کر ہی رہے تھے کہ انھیں روزنامچے کے انداز میں ایک کتاب 'دستنبو' لکھنے کا خیال آیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ 'دستنبو' لکھنے کے لیے اُنھوں نے 'برہانِ قاطع' کا مطالعہ شروع کیا ہو۔ الفاظ کی اصل اور اُن کے معنی پر غور کرتے ہوئے غالبؔ کو خیال آیا کہ 'دستنبو' ایسی فارسی میں لکھی جائے جس میں ایک لفظ بھی

عربی کا نہ آئے۔

'دستنبو' کی تالیف کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ غالبؔ برطانوی حکومت پر اپنی بے گناہی ثابت کریں لیکن اُنھوں نے سوچا کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں انگریزوں پر اپنی فارسی دانی کا سکہ بھی بٹھا دیا جائے۔

بہرحال، بے کاری میں ایک اور مشغلہ ہاتھ آیا۔ کچھ وقت 'دستنبو' کے لکھنے میں لگا اور کچھ اس کی طباعت کے اہتمام میں۔ کچھ عرصے بعد 'برہانِ قاطع' پر اعتراضات ترتیب دے کر 'قاطعِ برہان' کے نام سے شائع کیے۔ کتاب کا چھپنا تھا کہ خود غالب پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ بعض اہلِ علم ''برچھیاں اور بھالے'' لے کر غالبؔ کی طرف دوڑے۔ پھر تو ایک مستقل مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ اس معرکے میں غالب نے 'نامۂ غالبؔ' اور 'تیغِ تیز' دو رسالے اپنے نام سے شائع کیے اور دو رسالے 'لطائفِ غیبی' میاں داد خاں سیاح کے نام سے اور 'سوالاتِ عبدالکریم' عبدالکریم کے نام سے شائع کیے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے اردو خطوط اتنی تعداد میں لکھے کہ جب میں نے انھیں مرتّب کر کے شائع کیا تو یہ اردو خطوط پانچ جلدوں میں سمائے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ غالبؔ نے یہ علمی کام زندگی کے اس حصّے میں کیا، جب انھیں سب سے زیادہ ذہنی پریشانیوں کا سامنا تھا، صحت جواب دے چکی تھی اور بہ قول اُن کے بے ''دست و پا'' ہو چکے تھے۔ یہ سب وقت گزارنے کے مشغلے تھے۔ اس سلسلے کا سب سے اہم مشغلہ تھا خطوط نویسی۔ علمی مشاغل میں مصروف رہ کر غالبؔ کچھ دیر کے لیے خود کو بھول جانے میں کامیاب ہو جاتے تھے لیکن خطوط کے سہارے تو اُنھوں نے ایک بزم سجا رکھی تھی۔ جس میں اُن کے عزیز، دوست، معتقد، مداح، ممدوح اور شاگرد سب ہی شریک تھے۔ اس بزم کی فضا اکثر شگفتہ اور تصنع و تکلف سے پاک رہتی۔ غالب ان اہلِ بزم کو اپنے دکھ درد میں شریک کرتے، اپنی ناکامیوں کا ماتم کرتے اور کامیابیوں پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے۔ یہی نہیں بلکہ غالبؔ اس بزم میں شریک ہونے والوں کی خوشی اور غم میں خود بھی برابر کے شریک رہتے۔

حواشی

غالب کی اردو نظم و نثر (قلعے سے متعلق)

۱۔ میں نے اس باب میں کچھ اقتباس 'غالبؔ کے خطوط' کی پہلی جلد سے نقل کیے ہیں۔

۲۔ غالبؔ کے خطوط: ۲: ۶۱۰

۳۔ غالبؔ کے خطوط: ۳: ۲۷۳

۴۔ غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۰۷۳

۵۔ خط بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ، ۱۸۵۹ء

۶۔ غالبؔ کے خطوط: ۲: ۶۰۳

۷۔ غالبؔ کے خطوط: ۱: ۳۶۶

۸۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ

۹۔ نسخۂ عرشی: دیباچہ

۱۰۔ غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۰۴۲

غالبؔ کے متفرق اشعار

مدحیہ قصائد، قطعات اور غزلوں کے علاوہ غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں ایسے اشعار بھی کہے ہیں، جن میں غزل کے ایک یا ایک سے زیادہ شعروں میں بہادر شاہ ظفرؔ اور شہزادگانِ تیموریہ کی مدح کی گئی ہے۔

سنہ تصنیف ۱۸۳۸ء

غالبؔ کی نو اشعار کی ایک غزل ہے۔ یہ غزل ۱۸۳۸ء میں کہی گئی تھی۔ غالبؔ کا مطلع ہے۔

دھوتا ہوں جب میں، پینے کو، اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے، ضد سے کھینچ کے، باہر لگن کے پاؤں

اس غزل کا مقطع ہے۔

غالبؔ، مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؟
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

عام خیال ہے کہ خسرو سے مراد امیر خسرو ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہاں 'خسروِ شیریں سخن' سے مراد بہادر شاہ ظفرؔ سے ہے۔ میری دلیل ہے کہ بہادر شاہ ظفرؔ ۲۵ر اکتوبر ۱۸۳۷ء کو تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ظفرؔ ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ غالبؔ چاہتے تھے کہ ظفرؔ اگر اُن کے شاگرد نہ ہوں تو کم سے کم غالبؔ کو اُن سے قربت تو حاصل ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہ شعر اسی کوشش کی ایک کڑی ہے۔[۳۲]

☆☆☆☆☆

غالبؔ کی سات اشعار کی غزل کا مطلع ہے۔

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو

مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو

اس غزل کے آخری شعر میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے لیے ان الفاظ میں دعا مانگی ہے۔

غالبؔ بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں

دنیا ہو، یا رب، اور مرا بادشاہ ہو

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۴۷ء

غالبؔ کی ۱۸۴۷ء کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

حسن چہ گر چہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے

اس سے میرا مہِ خورشیدِ مہِ جمال اچھا ہے

اس غزل کے مطلع میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے آٹھویں بیٹے خضر سلطان کی اس انداز میں مدح کی ہے۔

خضر سلطان کو رکھے، خالقِ اکبر سرسبز

شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۴۷ء

غالبؔ کی نو اشعار کی ایک غزل ہے، جس کا مطلع ہے۔

گھر جب بنالیا ہے، ترے در پر، کہے بغیر

جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

اس غزل کے مقطعے میں بہادر شاہ ظفر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

غالبؔ، نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۴۷ء

اس غزل کا مقطع ہے۔

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان ہے غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

☆☆☆☆☆

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے لکھا ہے کہ

''سنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سن کر کہا: ''بھئی، ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔'' مرزا نے کہا: ''حضور! تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔''

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۰ء

غالبؔ کی آٹھ شعر کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں۔

مقطعے میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے لیے ان الفاظ میں دعا مانگی ہے:

غالبؔ، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے، جو کہتے تھے، نوکر نہیں ہوں میں

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۱ء

۱۸۵۱ء میں بہادر شاہ بہت بیمار تھے۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

''دسمبر ۱۸۵۱ء میں ریذیڈنٹ دہلی نے رپورٹ بھیجی کہ بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہیں اور حج کے لیے مکّہ معظمہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ غالباً غالب نے اسی موقعے پر کہا تھا۔

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۳ء

غالبؔ کی بارہ اشعار کی ایک غزل ہے، جس کا مطلع ہے۔

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو

اس غزل کے مقطعے میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح اس انداز میں کی ہے۔

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں، غالبؔ
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

سنہِ تصنیف ۱۸۵۳ء

غالبؔ کی ۱۸۵۳ء کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو، تو کیوں کر ہو

اس غزل کے مقطعے میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے شعر کے ایک مصرع کو اس طرح تضمین کیا ہے:

مجھے جنوں نہیں، غالبؔ، ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو، تو کیوں کر ہو[۴۰]

☆☆☆☆☆

غالبؔ کا ایک شعر ہے:

ملے، دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے، ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسروؔ، سراج الدین کو غالبؔ

اس شعر کے بارے میں حالیؔ نے لکھا ہے کہ

''مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہ اور امیر خسرو کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے اس وقت یہ شعر انشا کر کے پڑھا۔''

☆☆☆☆☆

قطعات

سنہِ تصنیف ۱۸۴۸ء

۱۸۴۷ء میں بہادر شاہ ظفؔر نے غالبؔ کو بیسن کی روغنی روٹی بھیجی جس کا ذکر غالبؔ نے درج ذیل قطعے میں اس طرح کیا۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۴۷ء

اے شَنشاہِ فلک مَنظرِ بے مِثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہہ و عدیل
پانو سے تیرے ملَے فرقِ ارادت، اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت، اِکلیل

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے، عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے، دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
کشن، اوجِ دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
کرم، داغِ نہ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زُہرہ نے ترک کیا حُوت سے کرنا تحویل
تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش، مرے اِنجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحّم، مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے، سرِ رشتۂ اوقات میں، گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے، بُنِ ناخنِ تدبیر میں، کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ، لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ، عَمر کی زنبیل
فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر

کلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش، تفصیل
نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر!
کعبۂ امن و اماں، عُقدہ کشائی میں یہ ڈھیل!

☆☆☆☆☆

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

بقول حالؔی جب پادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لیے بطور اولوش کے بھیجا کرتے تھے اُس کے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی پادشاہ کے حضور میں گذرانتے تھے۔ یہ قطعہ بھی اُسی قبیل کا ہے۔

''جس وقت چوبدار بادشاہی یہ اولوش لے کر آیا۔ ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا، موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اُس نے مرزا سے متعجب ہوکر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ پادشاہ کی سرکار سے اولوش کے تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا نے کہا ''ارے احمق! چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جنابِ الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظُلم ہوتے ہیں، مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ ہمارا بھی یہیں جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔''[۳]

سنہ تصنیف ۱۸۵۰ء

غالبؔ کی ایک مشہور غزل ہے، جس کا مطلع ہے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

غالبؔ نے ۹/جون ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں نواب کلب علی خاں کو لکھا ہے:

''جب بادشاہ نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمتِ تاریخ نگاریِ سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ میں لکھی، مقطع اس کا یہ ہے ۔

غالبؔ، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے، نوکر نہیں ہوں میں

''اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں خدا کرے کہ حضرت کو پسند آئے۔''

در پر امیرِ کلبِ علی خاں کے ہوں مقیم
شایستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں، اسدؔ
خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں[۴۲]

☆☆☆☆☆

سنہ تصنیف ۱۸۵۲ء

قطعہ اعتذاریہ

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سَو پشت سے، ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ، شاعری، ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں، اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفرؔ کا غلام ہوں؟
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو، مجھے، پَرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے، شہنشاہ کا ضمیر
سَوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ؟ ہاں، اس سے مدعا
جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زِ رَہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روے سخن کسی کی طرف ہو، تو رُوسیاہ!
سَودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی، پر طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں، غالبؔ، خدا گواہ!
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے[5]

بقول مولانا امتیاز علی خاں عرشی، یہ قطعہ سب سے پہلے مولوی محمد باقر دہلوی کے دہلی اردو اخبار، جلد ۱۴، نمبر ۱۳ مورخہ ۶ جمادی الاخر سنہ ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۸/ مارچ ۱۸۵۲ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا:

''حسب الحکم حضرت سلطانی، خلد اللہ ملکہ، جو جناب نواب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب اور جناب خاقانی ہند، ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم خاں ذوقؔ نے بتقریب شادی میرزا جواں بخت بہادر، مرشد زادۂ آفاق، کے کچھ اشعار بسبیل مبارک بادی سہرا اس ہفتہ میں حضور سلطانی میں سر دربار گزرانے تھے، مع چند اشعار علاوہ اس کے جو خاص نجم الدولہ بہادر نے پھر گزرانے، واسطے حظ و کیفیت اپنے ناظرین اہل بصر و بصیرت و ماہرین وواقفینِ فصاحت و بلاغت کے بموجب ترتیب درپیش ہونے کے ہم بھی درج اخبار کرتے ہیں۔''

غالبؔ نے جواں بخت کا سہرا لکھا تھا، اس میں جو مقطع لکھا تھا، وہ بہادر شاہ ظفرؔ کو ناگوار گزرا، اس لیے یہ غالبؔ نے معذرت کے طور پر ۱۸۵۲ء میں یہ قطعہ لکھا تھا۔[6]

☆☆☆☆☆

سنِہ تصنیف ۱۸۵۳ء

بہادر شاہ ظفرؔ کی غسلِ صحت کی خبر سن کر غالبؔ نے چار مصرعوں کا درج ذیل قطعہ کیا تھا۔

شاہؔ کے ہے، غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے ،کب دن پھریں حمام کے
عشق نے، غالبؔ، نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام اواخر ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں غالبؔ نے لکھا ہے:

''میں نے اس شعر کا پہلا مصرعہ بدل کر اس طرح کر دیا ہے
دیکھیے ،کب غسل فرماتے ہیں آپ؟

بہادر شاہ ظفر، شوال ۱۲۶۹ (جولائی ۱۸۵۳ء) میں بیمار ہوئے تھے اور اس مہینے کی ۲۳ر تاریخ (۲۱ر جولائی ۱۸۵۳ء) تک علیل رہے۔ شفا ہوئی مگر غالباً کمزوری کی وجہ سے غسلِ صحت کی تاریخ ٹلتی رہی اور بالآخر 'دہلی اردو اخبار' (جلد ۱۵، نمبر ۱۹، مورخہ ۲ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ، مطابق ۴ر دسمبر ۱۸۵۳ء) کی حسبِ اطلاع ۲۱ صفر کو غسلِ صحت فرمایا اور ۲۲ تاریخ کو دوسرے شاعروں کے ساتھ مرزا غالبؔ نے بھی قصیدۂ تہنیت پیش کیا۔ [ے]

☆☆☆☆☆

سنِہ تصنیف ۱۸۵۳ء

در مدحِ شاہ (ظفرؔ)

اے شاہِ جہانگیرِ جہاں بخشِ جہاں دار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ ہو وا

تو وا کرے اُس عقدے کو، سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے، کرے خِضر سکندر سے ترا ذکر؟
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں، جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مریدی ترا، فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا، توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ حرارت
ڈھونڈھے نہ ملے، موجۂ دریا میں، روانی
باقی نہ رہے، آتشِ سوزاں میں، شرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر؟
قاصر ہے ستایش میں تری، میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق، اہلِ بصارت
تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک!
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت! ۸

☆☆☆☆☆

بقول مولانا امتیاز علی خاں عرشی "یہ قطعہ نوروز کی مبارک باد پر مشتمل ہے اور نوروز، آفتاب کے برج حمل میں داخلے پر منایا جاتا ہے۔" میرزا صاحب سرور کو لکھتے ہیں:

"تحویل آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ ۲۲/مارچ کو واقع ہوتی ہے۔ کبھی ۲۱ کبھی ۲۳ بھی آپڑتی ہے۔ اس سے تجاوز نہیں۔" (عود:۳۲) دہلی اردو اخبار، جلد ۱۵، نمبر ۱۳، مورخہ جمادی الاخرہ ۱۲۶۹ھ مطابق ۲۴/مارچ ۱۸۵۳ء میں حضور والا کی نیاز معمولی دسترخوان کا ذکر ہے، جو یک شنبہ ۹ جمادی الاخرہ کو نوروز کے دن کی گئی تھی۔ یہ واقعہ میرزا سلیمان شکوہ بہادر کے پوتے میرزا نورالدین شاہی تخلص کی آمد دہلی کے بعد کا ہے، جن کی صحبت نے بہادر شاہ کو متہم بہ تشیع کیا تھا۔ اس لیے میری دانست میں یہ قطعہ مارچ ۱۸۵۳ء کا لکھا ہوا ہے۔"[9]

سنہِ تصنیف ۱۸۵۵ء

ایک دفعہ غالب نے مُسہل لیا تھا۔ مُسہل لینے والا بارہ دن تک گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا، اس لیے غالب کے لیے ان دنوں میں قلعے جانا ممکن نہیں تھا۔ اُنھوں نے دو اشعار کا ایک قطعہ کہا، جو بظاہر بارہ دن تک قلعے نہ جانے کی معذرت تھی۔ قطعہ درجِ ذیل ہے:

سہل تھا مُسہل، ولے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی، اتنے روز حاضر بن ہوے
تین دن مُسہل سے پہلے تین دن مُسہل کے بعد
تین مُسہل، تین تدبیریں، یہ سب گنے دن ہوے؟[10]

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۵ء

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں، کرتے ہوئے سلام

اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں[!!]

بقول الطاف حسین حالیؔ، بہادر شاہ ظفر کے دربار کا یہ حساب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چوں کہ اردو محاورے میں کانوں میں ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں ہم آشنا نہیں، اس لیے میرزا نے اُس کو اس پیرائے میں (درجِ ذیل قطعے کی صورت میں) بیان کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۵ء

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صَفَر، چلو

رکھ دیں چمن میں، بھر کے مئے مُشک بو کی ناند

جو آئے، جام بھر کے پیے، اور ہو کے مست

سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند

غالبؔ، یہ کیا بیاں ہے؟ بجز مدحِ بادشاہ

بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نِوشت خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں

ہے، جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ، ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے

لاکھوں ہی آفتاب ہیں، اور بے شمار چاند

اس قطعے میں جس رسم کی طرف اشارہ ہے اُس کی اصل یہ ہے کہ ماہ صفر کے آخری چہار شنبے کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم، بیمار ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے اُس دن دعا و استغفار اور صدقہ و خیرات کرنا

شروع کیا اور باغوں میں جا کر پند و وعظ کے جلسے کرنے لگے۔ امرا سنہری اور روپہلی چھلے بھی تقسیم کیا کرتے تھے۔[۱۲]

☆☆☆☆☆

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ، تماشائی

دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا، روے آب پر، کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے، باد پیمائی

کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی، غالبؔ
شاہِ دیندار نے شِفا پائی[۱۳]

۶۰؎ یہ قطعہ دہلی اردو اخبار، ۴ ستمبر ۱۸۵۳ء، بحوالہ نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۸ء، ص ص ۳۵۔۳۶ میں نقل ہوا ہے۔ یادگارِ غالب: ۱۷۱ اور ۱۷۳

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۵ء

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے

جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے

کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالبؔ ہے [۱۴]

اس قطعے میں دو الفاظ فتح وظفر استعمال ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ غالبؔ کی فتح سے مراد فتح الملک یعنی مرزا فخرو ولی عہدِ حکومت ہو اور ظفرؔ سے مراد بہادر شاہ ظفرؔ۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ مرزا فخرو کا انتقال ۱۰/ جولائی ۱۸۵۶ء کو ہوا تھا، جب کہ غالب نے یہ قطعہ ۱۸۵۵ء میں کہا تھا۔

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۵ء

غالبؔ جب قلعے میں تاریخ نویسی پر ملازم ہوئے تو اُن کو تنخواہ چھ ماہ بعد ملتی تھی۔ غالبؔ میں اتنی برداشت کہاں تھی۔ اُنھوں نے ۲۹، اشعار پر مشتمل درج ذیل قطعے کی صورت میں بہادر شاہ ظفرؔ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی۔ بقول مولانا الطاف حسین حالیؔ، بہادر شاہ ظفرؔ نے یہ درخواست منظور کر لی اور غالبؔ کو تنخواہ ماہ بہ ماہ ملنے لگی۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ

اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں

تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو آبرو بخشی

ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز

رُوشِناسِ ثَوابت و سَیّار

گرچہ، از روی ننگِ بے ہنری،

ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی

جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں، کہ ہوں

بادشہ کا غلامِ کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح

تھا ہمیشہ سے، یہ عریضہ نگار

بارے، نوکر بھی ہوگیا، صد شکر!

نِسبتیں، ہوگئیں مُشخّص، چار

نہ کہوں آپ سے، تو کس سے کہوں؟

مدّعای ضَروری الاظہار

پیرو مُرشِد، اگرچہ مجھ کو نہیں

ذوقِ آرایشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے، آخر

تا نہ دے ، بادِ زَ مہریر،آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟

جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے، اب کے سال

کچھ بنایا نہیں ہے، اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!
آگ تاپے کہاں تلک انساں!
دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار!
دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی
وَقِنا رَبّنا عَذَابَ النّار!
میری تنخواہ جو مقرّر ہے
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے، مُردے کی چھماہی ایک
خلق کا، ہے اسی چلن پہ، مَدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات
اور چھماہی ہو سال میں دو بار!
بسکہ لیتا ہوں، ہر مہینے، قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہوگیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیے

ہے، زباں میری، تیغِ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے

ہے، قلم میری، ابرِ گوہر بار

ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد

قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا!

آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار!

میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ

تا نہ ہو، مجھ کو، زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام

شاعری سے نہیں مجھے سَروکار

تم سلامت رہو ہزار برس!

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے پادشاہ کے حضور میں اس درخواست کے ساتھ گزرانا تھا کہ اُن کی تنخواہ جو ششماہی گزرنے پر اکھٹی چھ مہینے کی ملا کرتی ہے، وہ ماہ بہ ماہ ملا کرے۔ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بہ ماہ ملنے لگی تھی۔ (یادگارِ غالب، ص ۱۶۷) یہ قطعہ ۱۸۵۵ء میں تصنیف ہوا تھا۔[۱۵]

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۵ء

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی

اترائے کیوں نہ خاک، سرِ راہگزار کی

جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، ولے
کیوں کر نہ کھایئے؟ کہ ہوا ہے بہار کی [۱۶]

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۷ء

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قل
بچے ہے جوگ مایہ اور دیہی
نشاں باقی نہیں اب سلطنت کا
مگر، ہاں نام ہے اورنگ زیبی

۱۸۵۷ء میں ہنگامے کے دوران غالبؔ مغل حکومت سے بالکل ناامید ہو چکے تھے۔ چار مصرعوں کا یہ قطعہ اسی دوران کہا تھا۔ [۱۷]

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

جب غالبؔ نے یہ قطعہ اور ایک رباعی بہادر شاہ ظفرؔ کو سنائی تو بقول مولانا الطاف حسین حالیؔ، ظفر اور مصاحبین بے اختیار ہنس پڑے۔ (یادگارِ غالب: ۱۷۱۔۱۷۳)

☆☆☆☆☆

مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہ اور امیر خسرو کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے اس وقت یہ شعر انشا کر کے پڑھا۔

سنہ تصنیف ۱۸۵۵ء

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک، سرِ رہگزار کی

جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، ولے
کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

☆☆☆☆☆

حواشی

قطعات

۱- نسخۂ عرشی: ۱۲۳

۲- نسخۂ عرشی: ۱۲۳-۱۲۴

۳- نسخۂ عرشی: ۱۲۳: یادگارِ غالب: ۱۷۰

۴- مکاتیبِ غالب (چھٹا اڈیشن): ۵۳-نسخۂ عرشی: ۱۹۷-۱۹۸

۵- نسخۂ عرشی: ۱۲۴-۱۲۵

۶- نسخۂ عرشی: ۳۲۳-۳۲۴

۷- نسخۂ عرشی: ۳۲۶-۳۲۷

۸- نسخۂ عرشی: ۱۲۷

۹- نسخۂ عرشی: ۱۲۷

۱۰- نسخۂ عرشی: ۱۲۹

۱۱- نسخۂ عرشی: ۱۲۹-یادگارِ غالب: ۱۶۷

۱۲- نسخۂ عرشی: ۱۲۸

۱۳- نسخۂ عرشی: ۲۵۱

۱۴- نسخۂ عرشی: ۱۲۸-۱۲۹

۱۵- نسخۂ عرشی: ۱۲۵-۱۲۷

۱۶- نسخۂ عرشی: ۲۵۱

۱۷- نسخۂ عرشی: ۲۶۲

رباعیات

غالبؔ نے ۱۸۳۸ء کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں یہ رباعی کہی تھی۔

......(بعد از ۱۸۳۸ء، حاشیہ قبا) ۱۸۴۱ء (م)

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم
ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم[1]

☆☆☆☆☆

سنہ تصنیف ۱۸۳۸ء

بھیجی ہے مجھ کو جو، شاہِ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال[2]

پادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو پادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اُس دال کے شکریہ میں لکھی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۰ء

مولانا حالیؔ نے غالبؔ کے بارے میں 'یادگارِ غالبؔ' میں یہ دل چسپ واقعہ لکھا ہے کہ:

''ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہوگئی۔ چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں، جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ ان میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے، مجھ کو یاد رہ گئی ہے۔ رباعی ہے۔

جن لوگوں کو ہے، مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری؟

یہ پانچوں رباعیاں سیدالاخبار، دہلی، جلد ۸ ،شمارہ ۲۸، ۱۶؍نومبر ۱۸۵۰ء میں اور 'سراج الاخبار' ۸: ۲۸ (۱۲؍نومبر ۱۸۵۰ء) میں شائع ہوئی تھیں۔ بحوالہ نسخۂ عرشی زادہ، ضمیمہ نسخۂ عرشی، نقوش، نومبر ۱۹۶۴ء۔ 'سراج الاخبار' کے اس شمارے سے ان رباعیوں کا سنہِ تصنیف بھی معلوم ہوجاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حالیؔ نے اس سلسلے کی بس یہی رباعی دی ہے۔ کیوں کہ انھیں یہی یاد تھی۔ جب کہ غالبؔ نے پانچ رباعیاں کہی تھیں۔ اس سلسلے کی درجِ ذیل چار رباعیاں اور تھیں جو 'سراج الاخبار' میں شائع ہوئی تھیں۔ 'سراج الاخبار' کا متعلقہ شمارہ دستیاب ہوگیا، جس میں یہ چاروں رباعیاں شائع ہوئی

تھیں۔ یہ رباعیاں ہیں۔

اصحاب کو جو ناسزا کہتے ہیں
سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبی نے اون کو اپنا ہمدم
ہے ہے، نہ کہو، کسے بُرا کہتے ہیں

☆☆☆☆☆

یارانِ رسول یعنی اصحابِ کبار
ہیں گرچہ بہت، خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار
غالبؔ! وہ مسلمان نہیں ہے، زنہار!

☆☆☆☆☆

یارانِ نبی میں تھی لڑائی کس میں؟
الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں؟
وہ صدق، وہ عدل ، وہ حیا، وہ علم
بتلاؤ کوئی کہ تھی برائی کس میں؟

☆☆☆☆☆

یارانِ نبی سے رکھ تولا، باللہ!
ہر یک ہے کمالِ دیں میں یکتا، باللہ!
وہ دوست نبی کے اور تم اون کے دشمن
لاحول ولا قوۃ اِلّا باللہ![۳]

'سراج الاخبار' کی اسی اشاعت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رباعیاں کب کہی گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۳ء

بہادر شاہ ظفر کی سالگرہ کے موقع پر غالب نے درجِ ذیل رباعی کہی تھی۔

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے

تا شاہ، شیوعِ دانشِ و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ

ہے صِفر کہ افزائشِ اعداد کرے [۴۴]

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۲ء

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا

اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا

ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں

ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا [۴۵]

اس کا اِمکان ہے کہ یہ رباعی بھی بہادر شاہ ظفر کی سالگرہ کے موقع پر کہی گئی ہو۔

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۴ء

غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو ۴؍ جون ۱۸۵۴ء کو ایک خط میں لکھا ہے:

''اگرچہ تاب مجھ میں روزہ رکھنے کی کہاں۔ مگر بدتر روزہ داروں سے ہوں۔ روزہ داروں کو کیا کہوں، کیا حال ہے؟ میرے چار خدمت گار ہیں، چاروں روزہ دار۔ آخر روز مجھ کو یوں نظر آتا ہے کہ چار مردے پھر رہے ہیں۔ یہ پریشانی اور یہ بے سامانی! نہ خس خانہ، نہ برفاب۔

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
روزہ مِرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں [۶]

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۵ء

بقول مولانا الطاف حسین حالیؔ: ''بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے، اس کے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔''

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہہِ والا نے
گِن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے [۷]

☆☆☆☆☆

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ!!!
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے [۸]

بقول حالیؔ درجِ بالا رباعی میں مرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم ہر چند دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں مگر وہ ہماری کامروائی میں درنگ اور لیت ولعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں، پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح وشام کرنے والے ہیں۔ صبح وشام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چوں کہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے وہ صبح وشام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کامروائیِ خلق میں جیسی لیت ولعل وہاں ہوتی ہے ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔[9]

☆☆☆☆☆

حواشی

رباعیاں

۱- نسخۂ عرشی: ۲۵۳

۲- نسخۂ عرشی: ۲۵۳

۳- یادگارِ غالبؔ

۴- نسخۂ عرشی: ۲۵۴

۵- نسخۂ عرشی: ۲۵۴۔ ممکن ہے یہ رباعی ظفرؔ کی سال گرہ کے موقعے پر کہی گئی ہو۔

۶- نسخۂ عرشی: ۲۵۴

۷- نسخۂ عرشی: ۲۵۴: اور یادگارِ غالب: ۱۷۳

۸- نسخۂ عرشی: نسخۂ عرشی

۹- نسخۂ عرشی: ۲۵۴۔ یادگارِ غالب: ۱۷۳

غزلیات

غالبؔ کا وہ کلام جو اُنھوں نے قلعے کے مشاعروں یا بہادر شاہ ظفرؔ کی موجودگی میں پڑھا تھا۔

۱۸۴۷ء کے بعد

غالبؔ کی گیارہ اشعار کی ایک غزل ہے:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر اُستوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا؟

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؟
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا

جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں؟ کہ دل ہے

غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بری بلا ہے

مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟

نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا

جو دوئی کی بُو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان، غالبؔ!

تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اس غزل کے بارے میں لکھا ہے:

مرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ دہلوی، رام پوری نے اس غزل کی تخمیس کی ہے، جو اُن کے دیوان ،مطبوعہ شوال ۱۲۷۰ھ (جولائی ۱۸۵۸ء) میں موجود مولانا حالی نے لکھا ہے:

> ''سنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سن کر کہا: ''بھئی، ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔'' مرزا نے کہا: ''حضور! تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔''

☆☆☆☆☆

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم، کہ تو کیا ہے

تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

نہ شعلے میں یہ کرِشمہ، نہ برق میں یہ ادا

کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خو کیا ہے؟

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے

وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عَدو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے، پیراہن

ہمارے جَیب کو اب حاجتِ رَفو کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا

کُریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟

وہ چیز، جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز

سوای بادۂ گلفامِ مُشکبو کیا ہے؟

پیوں شراب، اگر خُم بھی دیکھ لوں دوچار

یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبُو کیا ہے؟

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی

تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

ہوا ہے شہ کا مُصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

☆☆☆☆☆

۱۸۴۷ء

شکوے کے نام سے، بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے!
گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے، سر گرمِ جفا ہوتا ہے
عشق کی راہ میں، ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد؟ کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے
خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن

شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہِ مہرِ علَم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے؟

سات اِقلیم حاصل جو فراہم کیجیے

تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال

آستاں پر ترے، مہ، ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں، آئینِ غزلخوانی میں

یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو، غالبؔ، مجھے اس تلخ نوائی میں مُعاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۰ء

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں!

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جاے دل؟

انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یا رب، زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟

لوحِ جہاں پہ حرفِ مُکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟

لعل و زُمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟

رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے؟

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

غالبؔ، وظیفہ خوار ہو، دو شاہؔ کو دعا

وہ دن گئے جو کہتے تھے، نوکر نہیں ہوں میں

☆☆☆☆

جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلطان تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے یہ غزل طرزِ تازہ پر لکھی۔

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۱ء

کہتے تو ہو تم سب، کہ بتِ غالیہ مو آئے

یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں، جذبِ محبت

کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مرے آتا نہیں، گو آے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرَین
ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آے

جلّاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے، جس بھیس میں جو آے

ہاں اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں، اور تری تقدیر کو رو آے

☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۲ء

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی، رنگارنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بَناتُ النّعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی، گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی، حوریں اگر واں ہوگئیں

نینداُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے، غزل خواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں، یارب دل کے پار؟
جو، مری کوتاہی قسمت سے، مژگاں ہوگئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہوگئیں

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی، گویا، رگِ جاں ہوگئیں

ہم مُوَحِّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزاے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۳ء

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے، اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں، ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے

گھِستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے، تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئنہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں، لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی، دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا

غالبؔ کو بُرا کیوں کہو، اچھا، مرے آگے

☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۳ء

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ جائے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ جانستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حسن اور اُس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، اور کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں، وہ نہیں خدا پرست، جاؤ، وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟

روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں؟[1]

[1] اس غزل کے بارے میں عرشی صاحب نے دہلی اردو اخبار، جلد ۱۵، نمبر ۴، مورخہ ۱۳ر فروری مطابق ۴ جمادی الاوّل ۱۲۶۹ھ کی ایک خبر کے مطابق درجِ ذیل تمہید کے ساتھ لکھا ہے:

"ایک مخمس جناب صاحب عالم مرشدزادہ بہادر مرزا نورالدین المتخلص بہ شاہ کے محامد اوصاف اخبارات گذشتہ لکھے تھے، تحقیق سنا گیا کہ بفرمودۂ حضور والا جناب نجم الدولہ اسداللہ خاں غالبؔ سحر بیان نے ایک غزل اسی ہفتے میں کہی تھی اور اس مقصود سے وہ غزل کہلوائی گئی تھی کہ مصرع لگانا جس میں دشوار اور ناممکن ہو۔ صاحب عالم بہادر ممدوح نے ادنیٰ غور و تامّل میں کمال عجلت سے مخمس کر کے پڑھ دیا۔ حضور والا اور سب حضار دربار والا نے نہایت پسند کیا۔ حضور نے پانچ دفعہ اس مخمس کو پڑھوایا اور بہت خوش ہوئے۔"

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۳ء

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو

کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو، تو کیوں کر ہو؟

ہمارے ذہن میں، اس فکر کا ہے نام وصال

کہ گر نہ ہو، تو کہاں جائیں، ہو، تو کیوں کر ہو؟

ادب ہے اور یہی کشمکش، تو کیا کیجیے؟

حیا ہے اور یہی گو مگو، تو کیوں کر ہو؟

تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا

بُوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیوں کر ہو؟

الجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ

جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو، تو کیوں کر ہو؟

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا

وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیوں کر ہو؟

ہمیں پھر اُن سے امید، اور انھیں ہماری قدر

ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ، تو کیوں کر ہو؟

غلط نہ تھا، ہمیں خط پر گماں تسلّی کا

نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیوں کر ہو؟

بتاؤ اُس مژہ کو دیکھ کر، کہ مجھ کو قرار

یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو، تو کیوں کر ہو؟

مجھے جنوں نہیں، غالبؔ ولے بقولِ حضور

فراق یار میں تسکیں ہو، تو کیوں کر ہو

دہلی اردو اخبار، جلد ۱۵، جلد ۱۵، نمبر ۱۰ مورخہ ۲۵ جمادی الاوّل ۱۲۶۹ء مطابق ۶ رمارچ ۱۸۵۳ء میں غزلہائے مشاعرۂ قلعہ کے زیرِ عنوان کئی شاعروں اور غزلوں کے ساتھ، غالبؔ کی یہ غزل بھی شائع ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ غالبؔ نے یہ غزل کسی مشاعرے میں نہیں، دربار میں پڑھی تھی۔ اس غزل کے مقطعے میں غالب نے ظفر کا مصرع تضمین کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

سنہ تصنیف ۱۸۵۲ء

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا

رکھیو، یارب، یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی ، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؟
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے، میری گور کے اندر، کھلا

منہ نہ کھلنے پر ، ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا، اور کہہ کے کیسا پھر گیا!
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر، کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش ،جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند؟
واسطے جس شہ کے غالبؔ ،گنبدِ بے در کھلا

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۲ء

حضورِ شاہ میں، اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں، خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحان، آخر
ابھی اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے
نسیم مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی؟
اُسے یوسف کی بوے پیرہن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر
غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ، سبحہ و زُنّار کے پھندے میں، گیرائی
وفاداری میں، شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے
وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

☆☆☆☆☆

سنِ تصنیف ۱۸۵۴ء

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟

نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

سبک سر بن کے کیا پوچھیں، کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

کیا غم خوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو

نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو؟

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

قفس میں مجھ سے روودادِ چمن کہتے نہ ڈر، ہمدم

گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

یہ کہہ سکتے ہو، ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ

کہ جب دل میں تمھیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے؟

نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

ہوئے تم دوست جس کے، اُس کا دشمن آسماں کیوں ہو؟

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں

عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو ؟

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۳ء

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہیے؟
ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟
یہ ضد کہ آج نہ آوے، اور آے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے؟
رہے ہے یوں گہ و بیگہ، کہ کرے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟
زہے کرشمہ، کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے بھی اُنھیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں، وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گزر ہے، کیا کہیے؟
تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کہیے؟
اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟

ہمیں، جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟
حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجیے ؟
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے؟
کہا یہ کس نے کہ غالبؔ برا نہیں؟ لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے؟

☆☆☆☆☆

سنہِ تصنیف ۱۸۵۲ء

نکتہ چیں ہے، غمِ دل، اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اُس کو، مگر، اے جذبۂ دل
اس پہ بَن جائے کچھ ایسی، کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے

تم کو چاہوں کہ نہ آؤ، تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اٹھے

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالبؔ

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

☆☆☆☆☆

سہرا

خوش ہو، اے بخت، کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ، شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور، سہرا

سر پر چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر، اے طَرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر، سہرا

ناؤ بھر کر ہی، پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اِس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولہا کے جو، گرمی سے، پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گُہر بار سراسر، سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں ایک چیز
چاہیے، پھولوں کا بھی ایک، مقرر، سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ، خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر، سہرا
رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ کہلاوے فروغِ مہ و اختر، سہرا؟
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گراں باری گوہر، سہرا؟
ہم، سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے، کوئی بڑھ کر سہرا؟

یہ سہرا سب سے پہلے دہلی اردو اخبار اور قران السعدین میں، بعد ازاں چمن بے نظیر میں، پھر نگارستانِ سخن میں اور اس کے بعد آبِ حیات اور دیوانِ ذوقؔ، مرتبہ آزاد میں شائع ہوا تھا۔ اس سہرے کی تفصیل اس کتاب میں 'جواں بخت کا سہرا؟ کے تحت بیان کی جا چکی ہے۔

بقول امتیاز علی خاں عرشی

''جہاں تک میرا علم ہے سہرا ردیف کے ساتھ غالبؔ سے پہلے کسی نے کوئی نظم نہیں لکھی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو میرزا صاحب اس نوع کی نظم کے موجد قرار پاتے ہیں۔''

سنہ تصنیف ۱۸۵۳ء

سلام

سلام اُسے، کہ اگر بادشا کہیں اُس کو
تو پھر کہیں، کہ کچھ اس سے سِوا کہیں اُس کو
نہ بادشاہ، نہ سلطاں، یہ کیا سِتایش ہے؟
کہو کہ خامسِ آلِ عَبا کہیں اُس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اُس کو
خدا کا بندہ ، خداوند گار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اُس کو؟
فروغِ جوہرِ ایماں، حسین ابنِ علی
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اُس کو
کفیلِ بخششِ اُمّت ہے بَن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اُس کو
مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے، کشتۂ تیغِ جفا کہیں اُس کو
وہ، جس کے ماتمیوں پر ہے، سَلسبیل، سبیل،
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اُس کو
عدو کے سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات

کہ جنّ و اِنس و مَلَک سب بجا کہیں اُس کو

بہت ہے، پایۂ گردِ رہِ حسین، بلند

بقدرِ فہم ہے، گر کیمیا کہیں اُس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک، ہر ایک ذرّۂ خاک

کہ نوکِ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اُس کو

ہمارے درد کی، یارب ، کہیں دوا نہ ملے !

اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اُس کو

ہمارا مُنہ ہے کہ دیں اُس کے حُسنِ صبر کی داد؟

مگر نبی و علی مرحبا کہیں اُس کو

زِمامِ ناقہ، کف اُس کے میں ہے کہ اہلِ یقیں

پس از حسینِ علی، پیشوا کہیں اُس کو

وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے

کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اُس کو

امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عِناد

پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اُس کو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں

علی سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اُس کو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ

بُرا نہ مانیے، گر ہم بُرا کہیں اُس کو

علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین

کرے جو اُن سے بُرائی، بھلا کہیں اُس کو
نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے
رکھے امام سے جو بُغض، کیا کہیں اُس کو
بھرا ہے، غالبِ دل خستہ کے کلام میں، درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اُس کو

☆☆☆☆☆

غالب کے دیوان میں صرف ایک ہی سلام ہے۔ یہ سلام رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ''دستور العملِ اودھ'' نام سے ایک مخطوطے میں شامل ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے یہ سلام 'دیوانِ غالب' اردو (نسخۂ عرشی) میں نقل کیا ہے۔ عرشی صاحب نے سلام کے بارے میں لکھا ہے:

> ''چوں کہ یہ (سلام) دستور العملِ اودھ میں منقول ہے اور یہ مخطوطہ شاہِ اودھ کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس میں بقول عرشی صاحب بہادر شاہ کی توقیعیں بھی منقول ہیں، اس لیے مجھے یقین ہے کہ یہ سلام بہادر شاہ ظفر کی شیعیت سے متعلق ہی رہا ہے اور اُس زمانے میں لکھا گیا ہے جب بہادر شاہ ظفر کی شیعیت کا تنازع پیدا ہوا ہے۔ اس زمانے میں یا کچھ ہی دن بعد یہ سلام لکھا گیا۔ اس سلام کا ایک شعر جس میں ایک نزاعی مذہبی مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، حذف کر دیا گیا ہے۔''

زبدۃ العلما مولوی سید علی نقی کی جس کشکول کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں غالب کا ایک سلام بھی ہے جو اُنھوں نے سلطان العلما مولوی سید محمد صاحب کو سنہ ۱۲۷۰ھ میں بھیجا تھا۔ یہ سلام رسالہ 'مبصر' لکھنؤ 'دستور العمل' میں بھی نقل کیا گیا ہے جس کا مطلع ہے۔

سلام اُسے کہ اگر بادشا کہیں اُس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

یہ سلام بھی متفرقاتِ غالب، ص ۳۱، نسخۂ عرشی اور دیوانِ غالب، مرتبہ مالک رام میں شامل ہے۔

سنہِ تصنیف ۱۸۵۳ء

بہادر شاہ ظفرؔ کی غزل پر غالبؔ کا مخمس

گھستے گھستے ، پانو میں زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر، قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا، کاش ! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی
کھنچ کے، قاتل، جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے، جانِ عاشقِ دلگیر، آدھی رہ گئی

بیٹھ رہتا، لے کے چشمِ پُرنم، اُس کے رو برو
کیوں کہا تو نے کہ، کہہ دل کا غم اُس کے رو برو؟
بات کرنے میں نکلتا ہے دَم، اُس کے رو برو
کہہ سکے ساری حقیقت نہ ہم، اُس کے رو برو
ہم نشیں، آدھی ہوئی تقریر، آدھی رہ گئی

تو نے دیکھا؟ مجھ پہ کیسی بن گئی، اے رازدار
خواب و بیداری پہ، کب ہے، آدمی کو اختیار؟
مثلِ زخم، آنکھوں کو سی دیتا، جو ہوتا ہوشیار

کھینچتا تھا، رات کو میں خواب میں، تصویرِ یار

جاگ اُٹھا، جو کھینچنی تصویر آدھی رہ گئی

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں، اے دل نواز

مستیِ چشمِ سیہ سے، چل کے، ہوویں چارہ ساز

تو صدای پا سے جاگا، تھا جو محوِ خوابِ ناز

دیکھتے ہی ، اے ستمگر، تیری چشمِ نیم باز

کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر، آدھی رہ گئی

اس بتِ مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات؟

جس کے حُسنِ روزافزوں کی یہ اک ادنیٰ ہے بات

ماہِ نو نکلے پہ، گزری ہوں گی راتیں پان سات

اُس رخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات

تابشِ خُرشیدِ پُر تنویر آدھی رہ گئی

تا مجھے، پہنچاے کاہش، بختِ بد ہے گھات میں

ہاں ، فَراوانی اگر کچھ ہے، تو ہے آفات میں

جز غم و رنج و الم، گھاٹا ہے ہر یک بات میں

کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں

آتے ہی، خاصیتِ اِکسیر آدھی رہ گئی

سب سے، یہ گوشہ، کنارے ہے، گلے لگ جا مرے

آدمی کو کیوں پکارے ہے؟ گلے لگ جا مرے

سر سے گر چادر اُتارے ہے، گلے لگ جا مرے

مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے؟ گلے لگ جا مرے

وصل کی شب، اے بتِ بے پیر، آدھی رہ گئی

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے؟

پر نصیب اپنا، اُنھیں جاتا سُنا، جوں پھر گئے

دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے

آ کے آدھی دور، میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے؟

کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی؟

ناگہاں یاد آ گئی ہے مجھ کو، یارب، کب کی بات؟

کچھ نہیں کہتا کسی سے، سن رہا ہوں سب کی بات

کس لیے تجھ سے چھپاؤں، ہاں، وہ پرسوں شب کی بات؟

نامہ بر، جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات

خط میں آدھی ہو سکی تحریر، آدھی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں، ہے یہ بھی غضب

ہاں، چھ گھنٹے کی تو ہوتی، فرصتِ عیش و طرب

شام سے آتے، تو کیا اچھی گزرتی رات سب!

پاس میرے وہ جو آئے بھی، تو بعد از نصفِ شب

نکلی آدھی حسرتِ تقریر، آدھی رہ گئی

تم جو فرماتے ہو: دیکھ، اے غالبؔ آشفتہ سر

ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے، گیا کیوں اُس کے گھر؟

جان کی پاؤں اماں! باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر

دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفرؔ

واں کے جانے میں، مری توقیر آدھی رہ گئی

☆☆☆☆☆

قلعے کے مشاعروں میں غالبؔ کی شرکت

۱۸۵۷ء سے قبل جب مغل حکومت کا چراغ بجھنے والا تھا تب بھی دہلی اور لال قلعے میں مشاعرے ہوتے تھے لیکن بہت کم۔ نواب ضیاالدین احمد خاں نیّر کے زیرِ اہتمام مشاعرے ہوتے اور ان کا اہتمام نواب زین العابدین عارف اور مجرُوح وغیرہ کرتے تھے۔ 'نسخۂ عرشی' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''یہ مشاعرہ ہر مہینے کے آخری جمعے کو ہوتا تھا۔ اس میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی طرحیں دی جاتی تھیں۔ لال قلعے میں بھی تیموریہ شہزادے مشاعرے کیا کرتے تھے۔''[1]

ایک وقت وہ آیا جب شہر میں مشاعرے تقریباً بند ہو گئے۔ ایک خط میں عبدالجمیل جنونؔ بریلوی کو غالبؔ لکھتے ہیں:

''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجیے گا اور اُس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا؟

میں کبھی اُس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے، اب ہی نہ ہو، اب کے ہو، تو آئندہ نہ ہو۔''[2]

قلعے کا پہلا مشاعرہ

غالبؔ نے ایسے پانچ مشاعروں کا ذکر کیا ہے جن میں اُنھوں نے خود شرکت کی تھی۔ غالبؔ نے ۲۲رفروری ۱۸۴۸ء کو قلعے میں منگل کے دن منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کا ذکر منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام ۲۲رفروری (سنہ ندارد) کے ایک فارسی خط میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ غالبؔ نے خط میں لکھا ہے:

> ''کل ایک تیموری شہزادے نے اپنے یہاں مشاعرے کی محفل سجائی تھی اور اہلِ سخن کو دعوت دی تھی۔ مجھے تو ریختہ گوئی سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے، اس لیے پریشان تھا۔ سوچتا تھا کیا کروں؟ لیکن جس دن مشاعرے میں جانے لگا تو جب میں ہوادار میں سوار ہو کر قلعے کی طرف جا رہا تھا۔ چند اشعار بے طلب اس دلِ غم زدہ سے ٹپک پڑے۔ تمھیں وہ اشعار بھیج رہا ہوں۔'' (فارسی سے ترجمہ)

'تلاشِ غالب'، مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی اس عبارت کے بعد غالبؔ نے یہ شعر نقل کیا ہے۔

ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

دوسرا مشاعرہ

ایک تیموریہ شہزادے مرزا نور الدین بہادر متخلص بہ شاہیؔ لکھنؤ سے ایک زمین لائے جو بہادر شاہ ظفرؔ کو پسند آئی۔ اُنھوں نے اس زمین میں غزل کہی اور غالبؔ سے بھی اس زمین میں غزل کہنے کی فرمائش کی۔ اس غزل کا مطلع ہے:

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

غالبؔ نے اگست، ستمبر ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیرؔ کو اس واقعے کی تفصیل لکھ کر سولہ اشعار کی پوری غزل نقل کی ہے اور لکھا ہے:

"بھائی! خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میرؔ و مرزاؔ کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزدگانِ تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا۔ سو میں حکم بجالایا اور غزل لکھی۔" [۴]

تیسرا مشاعرہ

ایک دفعہ مشاعرے میں شاعروں کو مدعو کرتے ہوئے اعلان کیا گیا" کچھ لوگوں کے واسطے یہ بات باعثِ مسرت اور دور رہنے والوں کے لیے یک گونہ بشارت ہے کہ بادشاہِ سپہر پناہ نے فرمان جاری کیا اور بارگاہ کے ناظر نے شاعروں نے ایوانِ نظارت میں اطلاع دی کہ ماہِ فروری ۲۵ تاریخ بروز جمعہ اس خجستہ نشیمن میں آئے اور جامِ سخن سے ایک دوسرے کے ساتھ بادہ نوشی کریں (یعنی شعروشاعری کریں) تیموریہ شہزادوں کی ایک جماعت اور شہریوں میں سے کچھ لوگ جمع ہوئے۔ ان سامعین کا ایسا اژدھام ہوا کہ جگہ تنگ پڑ گئی اور تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہی۔ سب سے پہلے سلطان الشعرا شیخ ابراہیم ذوقؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کی نذر کی اور ایسی خوش الحانی سے پڑھی تو مغنیۂ فلک زہرا آسمان سے نیچے اُتر آئی۔ اس کے بعد شہزادۂ یوسف دیدار ہمایوں آثار مرزا خضر سلطان اپنی خوب صورت آواز میں پڑھی تو گویا اپنے اشعارِ گوہر نثار کی شکل میں بساطِ بزم پر ستاروں کی بارش کردی۔ اس کے بعد مرزا حیدر شکوہ اور مرزا عالی بخت عالی نے سخن سرائی کی اور نغماتِ شعر کو بلند آہنگ کیا۔ مرزا عالی بخت کے ساتھ غالبؔ آشفتہ نوا بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے اس مشاعرے میں دس اشعار کی ایک غزل پڑھی۔ محوؔی نام کا ایک امرد جو امام بخش صہبائیؔ کے شاگردوں میں ہیں، نے اپنی صدائے طِفلانہ کے ساتھ محفل کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ مرزا حاجی شہرت نے سات اشعاروں کی اپنی ایک غزل پڑھی اور اس طرح اہلِ محفل اپنا یہ شاعرانہ تحفہ پیش کیا۔ میں آب گزاری کا بہانہ کر کے مشاعرے کی محفل سے باہر آگیا اور اپنے گھر چلا آیا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور چراغ جل رہے تھے۔ یوں سمجھیے کہ ابھی آدھی رات کا وقت نہیں گزرا تھا۔ میں نے اپنے بوریۂ بے ریائی پر اپنی محفل سجائی اور دو چار جامِ بادہ ناب نوش کیا۔ صبح کے بعد پھر بزمِ سلطانی میں گیا۔ چاروں شہزادوں نے جن کے نام میں پہلے لے چکا ہوں، زمزمۂ شبانہ سے محفل ایک نئی زندگی بخشی۔ میں نے دوبارہ غزل پڑھی۔ بعض ہم نشینوں سے معلوم ہوا کہ شعروشاعری کا دور ساری رات چلا تھا۔ بس صبح ہونے کے قریب ہی محفل برخاست ہوئی۔ کہتے ہیں کہ سلطان الشعرا نے مشاعرے کا اختتام اپنی دو غزلیں پڑھیں جو طرح میں نہیں تھیں۔ (فارسی سے ترجمہ)

پوری کوشش کے باوجود یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس مشاعرے میں غالبؔ نے کون سی دو غزلیں پڑھی تھیں۔[5]

چوتھا مشاعرہ

غالبؔ نے منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام ۱۰۔۲۳/اپریل ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں لکھا ہے کہ بہادر شاہ ظفرؔ کے حکم سے قلعے میں ایک مشاعرہ منعقد ہوتا ہے:

> ''یہاں بادشاہ نے قلعے میں مشاعرہ مقرر کیا ہے۔ ہر مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا ہے۔ پندرھویں کو اور انتیسویں کو۔ حضور فارسی کا ایک مصرع طرح کرتے ہیں۔ اب کے جمادی الثانی کی تیسویں کو جو مشاعرہ ہوا، اُس میں مصرعۂ فارسی یہ تھا:
>
> زیں تماشا گاہ گریاں می رود

ریختہ کا مصرع یہ تھا:

> خمارِ عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے، نظر ہے کیا کہیے، خبر ہے کیا کہیے
>
> میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دوسرا اسی طرح میں سے ایک اور صورت نکال کر لکھا۔ وہ تینوں غزلیں تم کو لکھتا ہوں پڑھ لینا اور میاں تفتہؔ کو بھی دکھا دینا۔ بچوں کو دعا کہہ دینا۔ تمھارا دوسرا خط مع رقعۂ ملفوفہ پہنچ گیا ہے۔
>
> والسلام والاکرام۔

غالبؔ کی فارسی غزل کا مطلع تھا:

چاک از جیب بداماں مے رود
تا چہ بر چاک از گریباں مے رود

دو اردو غزلیں نقل کی ہیں، جن کے مطلعے ہیں:

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے

ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

دوسری غزل کا مطلع ہے:

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے

تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

اس خط میں غالبؔ نے فارسی کی گیارہ شعر کی اور ایک اردو کی نو شعر کی اور دوسری گیارہ شعر کی غزلیں نقل کی ہیں۔[6]

یہ غزلیں اس کتاب میں 'فارسی کلامِ غالب' اور 'اردو کلامِ غالب' کے تحت نقل کی گئی ہیں۔

پانچواں مشاعرہ

منشی نبی بخش حقیرؔ نے غالبؔ کی دو غزلوں کے بارے میں کچھ دریافت کیا۔ اُن میں سے ایک غزل کا مطلع ہے ۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

غالبؔ نے چودہ اشعار کی یہ غزل بھی خط میں نقل کی ہے۔ غالبؔ نے منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام مئی، جون ۱۸۵۴ء کے خط میں لکھا ہے:

> ''تم کس ریختے کو نیا سمجھتے ہو، ''کہا کیے'' اور ''ہوا کیے'' یہ غزل پرانی ہے۔ ''دریا مرے آگے۔'' ''صحرا مرے آگے۔'' اس پر بھی ایک سال گزر چکا ہے۔ قلعۂ مبارک کے مشاعرے کی غزل ہے۔''

غالبؔ کی ایک غزل کا مطلع ہے ۔

سب کہاں ، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اس غزل کے بارے میں غالبؔ نے منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام ایک خط مورخہ اگست، ستمبر ۱۸۵۳ء میں لکھا ہے:

"بھائی! خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میرؔ و مرزاؔ کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزادگانِ تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا۔ سو میں حکم بجالایا اور غزل لکھی۔"[7]

غالبؔ نے آخری عمر میں شعر و شاعری تقریباً ترک کردی تھی۔ اُنھوں نے سید بدرالدین احمد کاشف المعروف فقیرؔ کے نام ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۷۱ھ مطابق ۳ جنوری ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی، ہاں ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں، سو وہ تمھارے دوست حسین مرزا صاحب کے پاس ہوں گی یا ضیاءالدین خاں صاحب کے پاس۔"[8]

اب میں غالبؔ کی اُس نظم و نثر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اُنھوں نے بہادر شاہ ظفر اور شہزادگانِ تیموریہ کے بارے میں کہے تھے۔

اس وقت ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی تخت تھے۔ ۱۸۴۷ء میں یا اس کے کچھ بعد غالبؔ کی گیارہ اشعار کی ایک غزل ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

اگر اور جیتے، یہی انتظار ہوتا

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اس غزل کے بارے میں لکھا ہے:

"مرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ دہلوی، رام پوری نے اس غزل کی تخمیس کی ہے، جو اُن کے دیوان، مطبوعہ شوال ۱۲۷۰ھ (جولائی ۱۸۵۸ء) میں شامل ہے۔"[9]

۱۸۴۷ء ہی میں غالبؔ نے درجِ ذیل غزل کہی تھی ۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ، تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرِشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خو کیا ہے؟

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے، پیراہن
ہمارے جیب کو اب حاجتِ رَفو کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟

وہ چیز، جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوای بادۂ گلفامِ مُشکبو کیا ہے؟

پیوں شراب، اگر خُم بھی دیکھ لوں دوچار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ وَ سبُو کیا ہے؟

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

ہوا ہے شہ کا مُصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟[۱۰]

حواشی

قلعے کے مشاعروں میں غالبؔ کی شرکت

۱- نسخۂ عرشی: دیباچہ

۲- غالبؔ کے خطوط: ۴: ۱۴۹۰

۳- غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۰۴۲

۴- غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۱۱۳_۱۱۱۴

۵- اوراقِ معانی (اردو ترجمہ): ۲۲۲_۲۲۴

۶- غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۱۲۴_۱۱۲۵

۷- غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۱۱۳_۱۱۱۴

۸- غالبؔ کے خطوط: ۱۰۴۲_۱۱۴۳

۹- نسخۂ عرشی: ۱۵۹_۱۶۰

۱۰- نسخۂ عرشی: ۲۴۱_۲۴۲

سنہِ تصنیف ۱۸۵۵ء

مثنوی در مدحِ فتح الملک

'دیوانِ غالب' میں ۱۳۲ اشعار کی مثنوی شامل ہے۔اس مثنوی کا ایک شعر ہے:

فخرِ دین، عزِ شان و جاہِ جلال
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

دوسرا شعر ہے۔

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارث گنج و تخت و افسر کو

ان دونوں اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مثنوی میں ولی عہدِ سلطنت شہزادہ غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو شاگردِ غالب کا ذکر ہے۔مرزا فخرو کا ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء میں (؟انتقال) ہوا تھا۔

ہاں، دلِ دردمندِ زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز؟
خامے کا صفحے پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے، کیا لکھیے؟
نکتہ ہائے خِرد فزا لکھیے
بارے، آموں کا کچھ بیاں ہوجائے
خامہ، نخلِ رُطَب فشاں ہوجائے
آم کا، کون، مردِ میداں ہے؟

ثمر و شاخ، گوے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟
آئے، یہ گوے اور یہ میداں!
آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپولے، تاک
نہ چلا، جب کسی طرح، مقدور
بادۂ ناب بن گیا، انگور
یہ بھی، ناچار، جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے؟
آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟
نہ گُل اُس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار
جب خزاں آئے، تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑایئے قیاس کہاں؟
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟
جان میں ہوتی، گر، یہ شیرینی
کوہکن، باوجودِ غم گینی
جان دینے میں اُس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر

کہ دواخانۂ ازل میں، مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قِوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغ بانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے، بحکمِ ربّ النّاس
بھر کے بھیجے ہیں، سر بمہر گلاس
یا لگا کر خِضر نے شاخِ نبات
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں، یہ نخل
ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں یہ نخل!
تھا ترنجِ زر ایک، خسروؔ پاس
رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس!
آم کو دیکھتا اگر یک بار
پھینک دیتا طِلائی دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سِدرہ کا جگر گوشہ
صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم

ناز پروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو

نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ وِلایتِ عہد

عدل سے اُس کے، ہے حِمایتِ عہد

فخرِ دین، عزِّ شان و جاہِ جلال

زینتِ طینت و جمالِ کمال

کار فرمای دین و دولت و بخت

چہرہ آرای تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ، ہُما کا سایہ ہے

خلق پر، وہ خدا کا سایہ ہے

اے مُفیضِ وُجودِ سایہ و نور

جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو

وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھیو!

اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو!

☆☆☆☆☆

تقریظے کہ بر کتابِ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نگاشتہ اند

('غالب اور شاہانِ تیموریہ' کی ابتدا میں بہادر شاہ ظفؔر کے مذہب کے تنازع کے بارے میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔ اس تنازع کے سلسلے میں بہادر شاہ ظفر کی ایک کتاب کا ذکر آتا ہے جس میں ظفر نے شیعیت سے اپنی بریّت کا اظہار کیا تھا۔

ظفؔر نے غالبؔ سے فرمائش کی تھی کہ وہ اس کتاب پر تقریظ لکھیں۔ غالبؔ نے تقریظ لکھی اور اس میں اختصار کے ساتھ ظفر کے عقیدے کی تبدیلی کے بارے میں لکھا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس سلسلے میں ان پر بھی بہت لعن طعن ہوئی تھی۔ پوری کوشش کے باوجود مجھے ظفر کی یہ کتاب کہیں نہیں ملی اور نہ ہی اس کتاب کا نام معلوم ہوسکا۔

غالبؔ نے ظفؔر کے عقیدے پر جو مثنوی لکھی تھی اُس میں ثابت کیا تھا کہ ظفؔر سُنّی العقیدہ ہیں۔ غالب نے اس مثنوی میں شیعہ عقائد کے خلاف کچھ ایسی باتیں کہی تھیں جو مناسب نہیں تھیں)۔

تقریظ

اللہ اللہ! نطق کو آفریدگار نے کیا پایہ اور کیا سرمایہ دیا ہے کہ امورِ دینی میں سے کسی امر کا شہود اور مصالحِ دنیوی میں سے کسی مصلحت کا وجود، بلکہ اگر بہ مثلِ اسمِ اعظم فرض کیجیے تو اس کی بھی نمود جب تک اس لطیفۂ غیبی کا شمول نہ ہو، عالم امکان میں ممکن نہیں۔

سخن را ازاں دوست دارم کہ دوست

بہ تصدیق از ما طلب گارِ اوست

مسائلِ حکیمانہ کی ہستی، ترہاتِ ندیمانہ کی مستی، درد و درماں کے مدارج کا اظہار، افسانہ و افسوں کے مقاصد کا مدار، شکوہ و شکایت کا عنوان، نفرین و آفرین کا بیان، ردّ و قبول کی حکایت، فتح و شکست

کی روایت، صرف ونحو کی راز دانی، لفظ و معنی کی گل فشانی، جو کچھ اگلوں نے کہا ہے، جو کچھ اب کوئی کہہ رہا ہے، جو کچھ آگے کہیں گے، اور قیامت تک کہتے رہیں گے، جو کچھ نیک و بد، نو و کہن سے ہے، سب وابستۂ نطق وسخن سے ہے۔ اب سمجھیے کہ سخن از روے مثال کیا ہے؟ چشمہ ہے، ندی ہے، سیل ہے، دریا ہے، کیسی روانی اور کس زور کا پانی۔ اس کا چڑھاؤ، اس کی رفتار، اس پر کس کا زور اور کس کا اختیار۔ جدھر منہ کیا، ادھر ایک نالہ بہا دیا، دریا کی لہر کیا گھوڑے کی باگ ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہو؟ بارہا دیکھا ہے کہ آغاز جس کو ہندی میں اُٹھان اور فارسی میں انگیزہ اور عربی میں باعث کہیے کچھ اور ہے۔ پھر وسط میں صورت بدل کر وہ کچھ اور ہو گیا کہ انجام سے قطع نظر فی الحال نہیں سمجھا جاتا کہ یہ کیا طور ہے۔

یہ کتاب کہ مجموعۂ دانش و آگہی ہے اگر چہ اس کو سفینہ کہہ سکتے ہیں، لیکن از روے حقیقت ایک نہر ہے کہ بحرِ سخن سے ادھر کو بہی ہے۔ جب اس نگارش نے انجام پایا تو مجھ کو پیش گاہِ سلطنتِ ابد مدت سے حکم آیا کہ بندۂ درگاہ، اسد اللہ اس کی تقریظ لکھنے میں اظہارِ حسنِ اطاعت کرے اور سخن طرازی میں آرائش زبان اردو پر قناعت کرے۔ جیسا کہ حکم بجالانا ضرور، ویسا ہی یہ بھی کہہ جانا ضرور کہ منشاء اس رسالے کی نگارش کا کیا ہے۔ ان اوراق کے ناظرین پر مخفی و مستور نہ رہے کہ سن اٹھارہ جلوسِ میمنت مانوس میں، نہ شہر سے بلکہ خارج سے، یہ آوازہ بلند ہوا کہ حضرت قدرِ قدرت، فلک رفعت، ثریا بارگاہ، انجم سپاہ، بادشاہ ابن بادشاہ، خلیفہ روے زمین، ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ، بادشاہِ غازی نے ترکِ مذہب آباے نام دار کیا اور تشیع کو تسنن پر اختیار کیا۔ باریافتگانِ بزمِ قرب و راز دانانِ خلوت انس حیران اور حیرت ان کی بجا۔ اگر بادشاہ نے کبھی یہ بات کہی ہوتی تو پہلے ان کو آگہی ہوتی۔ اسرارِ سلطنت کی خبر اور پھر اس میں عام کو تقدم خاص پر! نہ پوچھنے کا یارا، نہ چپ رہنا گوارا، علماے نام دار و مشائخ کبار و فقہاے دیار نے جرأت کر کے عرض داشت لکھی۔ مضمون یہ کہ ایسا سنا جاتا ہے اور باور نہیں آتا ہے۔ امید وار ہیں کہ خداوندِ تاج و سریر کے مافی الضمیر پر آگہی پاویں۔ حضور نے تحاشی کی اور فرمایا کہ کبھی ایسا داعیہ ہمارے ضمیر میں اور کبھی ایسا کلمہ ہماری زبان پر نہیں گزرا۔ بعد چند روز کے ایک دن حسب الحکم قضا تو ام!

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ

کعبۂ امن و امان کا در کھلا

شہنشاہِ گیتی پناہ، مسندِ جم نشین، اہلِ دلِ ہم نشیں، امراے دستہ دستہ دست بستہ، صفحہ نگار بھی مانند خار سر دیوار باغ و پروانہ پاے چراغ اس چمن میں نشاط اندوز اور اس انجمن میں ادب آموز۔ زبانِ

مبارک گہر فشاں ہوئی، حقیقتِ مذہب اہلِ سنّت و جماعت بیان ہوئی۔ سوءِ ظن علماء اس مجمع عظیم میں بہ پیرایۂ حسنِ ظن جلوہ گر ہوا، خاص و عام کو اعلیٰ حضرت کا ثباتِ قدم مسلکِ تسنن پر باور ہوا۔ مضامین ارشاد کیے ہوئے اعلیٰ حضرت کے۔ بموجب ارشاد۔ قالب نظم میں ڈھلے۔ ناگاہ جانب اجانب سے اُس نظم کے جواب میں کچھ وار چلے۔ یہ گنہ گار بے گناہ بھی بہ ذم ممدوح ہوا اور خنجرِ زبان کے زخم سے مجروح ہوا۔ الغرض جب وہ تحریر یہاں دیکھی دکھائی گئی تو اس میں خلفاء کی توہین پائی گئی۔ ناچار یہ رسالہ جیسا کہ حضرت مؤلف نے دیباچے میں لکھا ہے، لکھا گیا۔ اور مجھ کو تقریظ نگاری کے واسطے، جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، کہا گیا۔ میں اگر اس گزارش میں یہ سب نہ کہہ جاتا تو البتہ وضعِ تحریر کا موضوع لہ مجہول رہ جاتا۔ بحث و نزاع کا رسم و آئین اور ہے، شیوۂ سخن دانانِ معنی آفریں اور ہے۔ نہ سفیہ ہوں کہ ہجو میں سخن سرائی کروں۔ نہ فقیہ ہوں کہ بحث میں زور آزمائی کروں۔ غریب الوطن سپاہی زادہ ہوں، فلک زدۂ خانماں برباد دادہ ہوں۔ تابِ آفتابِ حوادث سے ظل اللہ کے سایۂ دیوار کی پناہ میں بیٹھا ہوں۔ گویا ایک تھکا ہوا مسافر ہوں۔ کہ آرام کی جگہ دیکھ کر دم لینے کو راہ میں بیٹھا ہوں۔ احسان ہے مجھ پر خدا کا کہ میں سوائے اپنے خدا کے، کہ وہ غیب داں اور اپنے بندوں پر مہرباں ہے، یہ نہیں کہ اور کسی کا گنہ گار ہوں۔ جو مجھ کو اپنا ہم کیش سمجھیں اُن سے دعاے مغفرت کا متوقع۔ اور جو مجھ کو اپنا مخالفِ مذہب گمان کریں اُن سے دعاے تخفیفِ عذاب کا امیدوار ہوں۔ حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر۔ فقط[1]

[1] اردوے معلیٰ، حصہ دوم، اسد اللہ خاں بہادر غالبؔ، مطبع نامی مجتبائی، دہلی، ۱۸۹۹ء ص ۸۔ ۱۱

دیباچہ کہ بر سراج المعرفت مِن تصنیف مولوی مُفتی سید رحمت علی خان بہادُر عرف مفتی میر لال صاحب نگاشتہ اند

('سراج المعرفت' مفتی سید رحمت علی خاں عرف میر لال کی تصنیف ہے۔ مفتی صاحب اپنے عہد کے بہت بڑے عالم اور فاضل انسان تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ان کو سراج العلماء، ضیاء الفقہا سید رحمت علی خاں بہادر کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ سر سید احمد خاں مفتی صاحب کے بہت بڑے مدّاح تھے۔ اُنھوں نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف 'آثار الصنادید' میں مفتی صاحب کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''کمالاتِ ظاہری و باطنی آپ کے حدِ تقریر و احاطۂ تحریر سے متجاوز ہیں۔ علاوہ کمال توغل مشاغل علمی کے شائستگی اوضاع و پسندیدگی اطوار، حسنِ خلق اور کمال بردباری و حلم اس مرتبہ پر ہے کہ بیان اس کا مجال خامہ و حوصلۂ نامہ نہیں۔ قدیم الایام سے عہدۂ استفتا کا سلاطینِ سلف کی طرف سے انھی کے خاندان عالی شان میں مستمر ہے۔ اب یہ عہدہ آپ کی ذات برکات سمات سے مشرف و مفتخر ہے۔ آبا و اجداد راقم کو ان کے خاندان بلند مکان کے ساتھ رابطہ اتحاد قدیمی چلا آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ نظر توجہ ان حضرت کی راقم آثم کے حال پر بہ کمال مبذول ہے۔ بہ سبب کثرت شرائف مشاغل یعنی توغل علمی کے نظم و نثر کی طرف مطلق توجہ نہیں۔''

مفتی صاحب نے 'سراج المعرفت' بہادر شاہ ظفر کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس کتاب میں وہ اشغال و اذکار بیان کیے گئے ہیں جو عہدِ رسالت سے سینہ بہ سینہ و سفینہ بہ سفینہ' چلے آئے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر

نے مفتی صاحب سے یہ بھی فرمائش کی تھی کہ 'سراج المعرفت' نامی کتاب میں جو کچھ لکھا جائے۔ وابستہ بسلاسلِ فقرا و منقولہ من رسائل العرفا ہو۔ مرزا غالب نے اس کتاب پر وہ دیباچہ لکھا جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ اس دیباچے کے آخر میں غالب نے بادشاہ سے یہ فرمائش کی ہے کہ وہ غالب کو دو برس کی پیشگی تنخواہ دے دیں تا کہ غالب خانۂ خدا کا طواف کر سکیں اور وہاں جا کر اپنے ۵۷ برس کے گناہوں کو جن میں سوائے شرک کے سب کچھ ہے۔ خدا سے بخشوا کر واپس آئیں۔ اس دیباچے سے یہ پتا چلتا ہے کہ غالب نے جب یہ دیباچہ لکھا ہے تو وہ بہادر شاہ ظفر کے ملازم تھے۔ نیز اس وقت غالب کی عمر ۵۷ سال تھی۔ اس حساب سے یہ دیباچہ ۱۸۵۳ء میں لکھا گیا ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے 'مجموعۂ نثرِ غالب اردو' میں قاضی عبدالودود کی ایک تحریر نقل کرتے ہوئے سہ ماہی مجلّہ 'معاصر' حصہ ۷ (پٹنہ) میں 'سراج المعرفت' پر ایک نوٹ لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ نادر خطوطِ غالب میں رسا ہمدانی نے یکم جنوری ۱۸۵۰ء کے ایک جعلی خط میں اس دیباچے کی عبارت نقل کر ڈالی ہے۔

بقول قاضی عبدالودود 'ظالم نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ۱۸۵۳ء کے تصنیف شدہ دیباچے کی عبارت ۱۸۵۰ء میں کہاں سے آ گئی۔

[مجموعۂ نثرِ غالب اردو، ص ۲۲۲])

سبحان اللہ آدمی اور خدا کی حمد و شکر کا دعویٰ! حمد و شکر کی گزارش کا سرمایہ دو قوتیں ہیں۔ فکر اور نطق اور یہ دونوں قوتیں موہبی ہیں۔ بخشی ہوئی دست گاہ پر خودنمائی۔ اور پھر اُسی بخشنے والے کے آگے! کیسی تنگ ظرفی ہے اور کیسی ہرزہ درآئی۔ اس صورت میں ادائے حقِ حمد کے تو کیا معنی، مگر ہاں حمد کرنے والا بہ قدرِ توفیقِ حمد شائستۂ آفرین ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے؟ کہ توفیق نتیجۂ کشت دکار ہے؟ البتہ عطیۂ پروردگار ہے۔ قدرتِ حمد اُس نے پیدا کی، توفیقِ حمد اُس نے عطا کی۔ جب کہ آدمی حمد کا عازم ہو تو سپاس عطیۂ توفیق کیوں نہ لازم ہو؟ ہاں، اے حق شناس! اگر تجھ کو شعور ہے، عطیۂ توفیق شکر پر ایک اور شکر ضروری ہے۔

گر کسے شُکرِ حق فزون گوید
شُکرِ توفیق شُکر چُوں گوید

حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نامۂ درہم پیچیدۂ سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے: 'لَا مُؤثِّرَ فِي الْوُجُودِ اِلَّا اللّٰہ'، اور خط میں مندرج ہے 'لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ' اور اس

خط کالا نے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔

ختمِ نبوت کی حقیقت۔ اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مَراتبِ توحید چار ہیں: آثاری و افعالی وصفاتی وذاتی۔ انبیاے پیشین صلوٰات اللہ علیٰ نبینا علیہم، اعلانِ مدارج توحید سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیاء کو حکم ہوا کہ حجابِ تعینات اعتباری اُٹھاویں اور حقیقت نیرنگیٔ ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھاویں۔ اَبْ گنجینۂ معرفت خواصِ اُمّتِ محمدی کا سینہ ہے اور کلمہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ۔ مفتاح بابِ گنجینہ ہے۔ رہے عامۂ مومنین کہ وہ اِس کلام سے صرف نفیِ شرک فی العبادت مراد لیتے ہیں اور نفیِ شرک فی الوجود، جو اصل مقصود ہے اُن کی نظر میں نہیں۔ جب۔۔۔ لَآ اِلٰـهَ اَلّا اللّٰهُ کے بعد محمد رسول اللہ کہیں گے، اُس سے اسی توحیدِ ذاتی کے اعتقاد کی قدم گاہ پر آرہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعتِ محمدیؐ کی اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے اور اسی مقام سے ناشی ہے، نداے روح فزاے "مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰـهُ دَخَلَ الْـجَـنَّـةَ." قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے، لیکن وحدتِ حقیقی کا راز دان ہے۔ گفتگوے توحید میں وہ لذّت ہے کہ جی چاہتا ہے کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت ذو جہتیں ہے: ایک جہتِ خالق کہ جس سے اخذِ فیض کرتا ہے اور ایک جہتِ خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے:

نبی را دو وجہ است دل جوے خلق

یکے سُوے خالق، یکے سُوے خلق

بداں وجہ از حق بُوَد مستفیض

بدیں وجہ بر خَلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے، اَلْولَایَۃُ اَفْضَلُ مِنَ النُّبُوۃِ ۔ معنی اس کے صاف اور از روے انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی کہ وہ وجہ اِلَی الحق ہے، افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے نبوتِ خاص سے۔ جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت اُلوہیّت سے، اُسی طرح ولی مستنیر ہے انوارِ نبوت سے۔ مستنیر کی تفضیل منیر پر اور مستفیض کی ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں۔ اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی کا تھا، نبوت کے ساتھ منقطع ہوگئی، مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃِ نبوت سے، ہنوز باقی ہے۔ نقل وتحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے اور یہ سراجِ ایزدی تا ظہورِ صبحِ قیامت روشن رہے گا

اور اب اسی کا نام ولایت اور یہی مشعلِ طریقِ ہدایت ہے۔ ولایت و ہدایت، وہی حقیقت توحیدِ ذاتی ہے کہ جواز روئے کلمہ لا اِلٰہَ اِلا اللّٰہ مشہود و عیون اعیان اُمّت اور منظورِ نظرِ اکابرِ ملّت ہوئی ہے۔ مگر وہ بات اب کہاں ہے؟ کہ یک بار لا اِلٰہَ اِلا اللّٰہ کہے اور دل نورِ معرفت سے منوّر ہو جاوے اور وہ ضامنِ زبردست کہاں کہ قائل۔ لا اِلٰہَ اِلا اللّٰہ کو اگرچہ اس کے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو، قدم گاہِ توحید پر قائل کر دے، یعنی رسول مقبول واجب التعظیم، قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم۔ اَب سعادت بہ قدرِ ارادت ہے اور راحت بعد جراحت سچ بھی تو ہے، آدمی کیوں کر سمجھ سکے اور بطلانِ بدیہیات کے جواز پر اُس کو کیوں کر تسلّی ہو، یعنی اس مجموعِ موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں، نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے:

اے کردہ بہ آرائشِ گفتار پسیچ
در زلفِ سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش می دانی
ذاتے است بسیط و منبسط، دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے کہ وہ اطبّاے روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوسِ بشری پر وہم غالب ہے اور بہ سبب استیلاے وہم مشاہدۂ وحدتِ ذات سے محروم رہے جاتے ہیں، ہر چند اُن کو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے، ناچار اشغال و اذکار وضع کیے تا قوّتِ متخیّلہ اُس میں اُلجھی رہے اور رفتہ رفتہ بے خودی طاری ہو جاوے۔ وحدتِ وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اس کو بہ جبر یا بہ تکلّف ثابت کیا چاہتے ہیں:

دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔ پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا، بے شبہ اپنے کام سے یعنی صورت گری و پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بے بری و بے خودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بہ مجرد فہم حاصل ہوتی ہے، اس شاغل کے نفس کو بے خودی میں آ گئی۔ ایک دریا میں جان کر کودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے ڈھکیل دیا، انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدتِ وجود کو سمجھ لیں، یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں، مگر ہاں کم ہیں اور مخفی ہیں اور کہیں کہیں ہیں اور ایسے نفوس جو کسب حالتِ بے خودی کے واسطے محتاج

اشغال واذکار ہیں بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں۔ حق سُبحانہ ہمیشہ سلامت رکھے حضرتِ شہنشاہِ، حق شناس، حق آگاہ سراج الملتہ والدین ابوظفر بہادر شاہ کو جو لباسِ بادشاہی میں یادِ الٰہی کر رہے ہیں:

شاہی و درویشی ایں جا باہم ست

بادشاہِ عہد قُطبِ عالم است

حکم دیا۔ حضرت پیر و مرشد برحق نے جناب افادت مآب، معرفتِ نصاب۔ مجمع البحرین شرع و عرفان، قران السعدین عقل وایمان، ابوحنیفۂ ثانی، سراج العلماء، ضیاء الفقہاء، مولانا مفتی سید رحمت علی خاں بہادر کو اور فرمایا اُن سے کہ وہ اشغال واذکار جو انتہائے قوسِ نزولی نبوت و ابتدائے قوس عروجی ولایت یعنی عہد جنابِ رسالت علیہ السلام سے ہم سینہ بہ سینہ وہم سفینہ بہ سفینہ چلے آئے ہیں، اُن کو ایک رسالے میں درج کریں اور اس رسالے کی تحریر میں وہ عبارتِ اردو کہ صاف اور بے تکلف ہو، خرچ کریں۔ کیوں نہ اربابِ فہم اس رازداری پر قربان جائیں کہ مجموع اشغال واذکار زبان حقیقت ترجمان سے فرمائے ہیں۔ اور حکم دیا ہے کہ اُن کو وابستہ بسلاسلِ فقرا و منقولہ من رسائل العرفا تحریر کریں۔ قضارا یہ تُرک کج مج زبان، اسداللہ خاں ہیچ مدان کہ جس کا فنِ سخن میں غالب نام اور وہ خود مغلوب ہوسہائے خام ہے، اس رسالے کے مشاہدے سے مستفیض ہوا۔ جی میں آیا کہ اس کتابِ مستطاب پر ایک دیباچہ لکھیے اور پھر میں برگِ سفر ساز کروں اور عزمِ سفرِ حجاز کروں۔ زمزم کے پانی سے وضو کروں اور اُس کاشانۂ ملائک آشیانہ کے گرد پھروں اور حجرِ اسود کو چوموں اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ کو جاؤں اور خاکِ تربتِ اطہر کا سرمہ آنکھوں میں لگاؤں۔ بادشاہ سے کیا عجب ہے کہ دو برس کی تنخواہ دے کر مجھ کو خانۂ خدا کے طواف کی رخصت دیں کہ یہ گناہ گار وہاں جاوے اور اگر زیست باقی ہے تو وہاں جا کر اور اپنے ستاون برس کے گناہ کہ جس میں سوائے شرک کے سب کچھ ہے، بخشوا کر پھر آوے:

غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است

رفت آں کہ عزم خلخ و نوشاد کردمے

غالب نے ۱۸۵۱ء میں ایک غزل لکھی تھی، جس کے مقطعے میں بہادر شاہ ظفر سے یہ فرمائش کی تھی کہ آپ حج پر جا رہے ہیں، اگر مجھے بھی ساتھ لے چلیں تو میں حج کا ثواب آپ کی نذر کر دوں گا۔ غالب کا شعر ہے:

غالبؔ ، گراس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

بہادر شاہ ظفرؔ کا ارادہ تھا کہ وہ حج پر جائیں۔ اس سلسلے میں دسمبر ۱۸۵۱ء میں دہلی کے ریذیڈنٹ نے جو رپورٹ بھیجی تھی۔ اس میں لکھا تھا:

''بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہے۔ حج کے لیے مکۂ معظمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔''

غالباً اسی موقعے پر غالبؔ نے وہ غزل لکھی تھی، جس کا یہ مقطع ہے۔

(دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی نقشِ ثانی، ص ۳۲۵)

☆☆☆☆☆

خطاب زمیں بوس

('مہرِ نیم روز' مترجمہ سید عبدالرشید فاضل کے ابتدائی دو حصّوں کو میں نے یہاں اس لیے نقل کیا ہے کہ اگرچہ 'مہرِ نیم روز' کا تعلق شاہانِ تیموریہ سے ہے لیکن اس کتاب کے دو ابتدائی ابواب کا تعلق خود غالب کی زندگی سے ہے۔)

'اے قاآن شیوہ خاقان! اور بادشاہوں کے بادشاہ! نہیں نہیں اے سلیمان مرتبہ سلطان! اور مصطفوی خو سلیمان! میں عدم سے وجود میں گہر سنجی و گوہر فروشی کے لیے آیا تھا میری متاعِ گراں مایہ نے اس چار جہت میں رواج کا منہ نہیں دیکھا۔ اور میری جنسِ بیش بہا نے اس بازار میں قیمت نہیں پائی۔ ناچار جو کچھ اپنے ساتھ لایا ہوں، کیوں کر کہوں کہ اپنے ہی ساتھ لے جا رہا ہوں۔ کسی قدر کتابوں میں اور کسی قدر سینوں میں چھوڑ کر دنیا سے جا رہا ہوں۔ میرے بعد اگر اس گنجِ شائگاں کو ہَوا اُڑا دے، اڑا دے! اگر خاک کھا جائے، کھا جائے!!! (میں کیا کروں) سینہ جواں مرگ آرزوؤں کا مدفن ہے تو نگاہِ گرم کو چراغِ گورِ غریباں ہونا چاہیے! میرے اجداد افراسیاب اور پشنگ کی اولاد سے تھے اور دانش و دبدبہ والے حکمراں۔ کینۂ کیخسرو کی ہوائے آستیں سے تور کے بیٹے (افراسیاب) کی زندگی کا چراغ بجھ جانے کی وجہ سے پشنگ کے خاندان والوں کو یہ روزِ سیاہ دیکھنا پڑا کہ تخت و تاج کے وارثوں کے ہاتھ میں اس ساز و سامان میں سے سوا تیغِ سبز فام کے اور کچھ نہ رہا۔ غیر کی سرزمین کی طرف رُخ کیا اور شمشیر زنی کے ذریعے روٹی کھانے لگے۔ انھی نیستاں کے محلوں اور پہاڑ کے نشیمنوں میں رہنے والوں میں سے سلجوقیوں نے دوبارہ سر کو تاج سے اور تاج کو جواہر سے آراستہ کیا۔ گردش کرنے والے آسمان نے، جیسے کہ اس کی عادت ہے، ان کاؤس نوبت بادشاہوں کو بھی برباد کر دیا...... نظم......

در مشربِ ما خواہشِ فردوس نجوئی
در مجمعِ ما طالعِ مسعود نیابی

در بادهٔ اندیشهٔ ما دُرد نہ بینی

در آتشِ ہنگامۂ ما دوُد نیابی

ترجمہ: اے مخاطب! تو ہمارے مشرب میں فردوس کی خواہش نہ تلاش کر۔ تو ہمارے گروہ میں طالع مسعود نہیں پائے گا۔

ہمارے خیال کی شراب میں تو دُرد نہیں دیکھ سکتا اور ہمارے ہنگامے کی آگ میں تجھے دھواں نہیں ملے گا۔

اس قافلے کے پس ماندوں میں سے میرے دادا جو ولایت ماوراءالنہر کے شہر سمرقند میں پیدا ہوئے تھے، ایسے سیلاب کی طرح جو بلندی سے نشیب میں آتا ہے، سمرقند سے ہندوستان میں آئے اور سپہ سالارِ شاہ نشاں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کے دفتر میں اس کو بادشاہ کی ملازمت کا فرمان لکھ دیا گیا اور پرگنۂ پہاسواس کے اور اس کی سپاہ کے وظیفے میں مقرر ہو گیا۔ میرا باپ بھی اپنے باپ ہی کا پیشہ رکھتا تھا۔ اس نے بھی لڑائی میں جامۂ ہستی اتارا۔ مگر تیری ثنا کی شاخ کے لیے ایک نئے انداز سے گانے والے بلبل کی ضرورت تھی، اس لیے خدا نے مجھے سخن فہم اور سخن گو پیدا کیا۔ رباعی۔

غالب بگہرز دودهٔ زاد شمم

زاں روبہ صفائی دمِ تیغ است دمم

چوں رفت سپہدی زدم چنگ بشعر

شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

ترجمہ: اے غالب! میں نسلاً خاندانِ زاد شمم سے ہوں۔ (اس لیے) میرا نفس دمِ تلوار کی سی صفائی رکھتا ہے۔ جب سرداری اور سپہ سالاری نہ رہی تو میں نے شعر گوئی اختیار کی۔ اجداد کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا۔

خاکم بسر کہ غرورِ آزادہ روی کے فریب میں آکر، بے سوچے سمجھے، شعر گوئی شروع کردی۔ قدرِ سخن کا اندازہ اور اپنے خاندان کی بلندی رتبہ کو نہ پہچانا۔ میرا سینہ ایک نفَس رکھتا تھا، اس نسیم کے مانند فرحت افزا جو نسترن زار کی طرف سے آتی ہے۔ میری زیاں پسندی کو دیکھیے کہ میں نے اس کو سوا غیر ضروری باتوں کے اور کہیں صرف نہ کیا۔ میری انگلیوں میں ایک قلم تھا، ایسے دجلہ بار ابر کی مثال، جو قبلہ کی طرف سے اُٹھے (مگر) میں کس درجہ بے ہودہ کوش ہوں کہ میں نے اس کو زمینِ

شور میں برسا دیا۔ فرد۔

با ایں فروغ گوہر درخشانی نہاد

زیں ساں سیاہ روز کرا کرد روزگار!

ایسا روشن نسب اور شاندار ذاتی صلاحیتوں کا حامل ہوتے ہوئے، زمانے نے ایسا سیاہ بخت اور کس کو کیا ہے!

عقل و ہوش سے بے گانہ ہوں اور نام و ننگ کا دشمن، کمینوں کا ہم نشیں ہوں اور اَوباشوں کے رنگ میں رنگا ہوا۔

پاؤں بے راہ چلنے والا اور زبان بے مقصد بولنے والی۔ اپنی شکست میں آسمان کا معاون اور اپنی آزار رسانی میں دشمن کو تدبیر سکھانے والا، دل افکار و آلام سے معمور اور آنکھیں خون کے آنسو رونے والی، نہ خود نماؤں کی طرح آرائش اور نہ آزادوں کی طرح ساز و سامانِ راحت۔ ہر شخص کی سرگزشت وہی ہوتی ہے جو ازل میں اس کے لیے مقدر ہو چکی ہے (اس لیے) جو کچھ مجھ پر گزری دوستوں کو مجھے سرزنش نہیں کرنی چاہیے اور نہ مجھے دشمنوں کے ساتھ پرخاش رکھنی چاہیے۔ فرد

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست چرخ

دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد!

لنگر آندھی نے توڑ دیا اور کشتی آسمان نے توڑ دی۔ عقل مند افسوس کرتا ہے کہ ہائے نادان نے یہ کیا کیا۔

پچاس سال کی آوارہ گردی کے بعد کہ (جب) میری تیزیِ رفتار نے مسجد و بت خانہ کی خاک اُڑا دی اور خانقاہ اور میکدے کو ایک کر دیا۔ اس شانِ ایزدی کی روشنی کی بدولت کہ جس نے فریدوں کا دل کرامتِ عدل سے روشن کیا اور مجھے سخن وری کا سلیقہ سکھایا۔ مجھے اس دروازے پر لائے کہ جہاں تیری آنکھ بھی حلقے کی طرح اس دروازے سے لگی ہوئی ہے اور (آنکھ کو) اس در سے ہٹا نہیں سکتا۔ بیدار دل، صاحب بصیرت، پاک سرشت، بلند نژاد راہ سیر و سلوک کا جادہ شناس اور جادۂ فقر و فنا کا راہنما۔ شاہدِ یقین کے مشاہدۂ جمال میں محو۔ مولانا محمد نصیرالدین پر فخر کرتا ہوں کہ جو کوئی اس ہمایوں آثار دیوار کے سائے میں قدم رکھے تو تعجب کی بات نہیں۔ اگر اس کا سایہ فردوس کے دروازے پر پڑ جائے۔ خلقت کی زبان پر اس کی تعریف، اور بینائی کی آنکھیں اس

سے روشن۔ منصور کے ترانے (اناالحق) کی اس کے حق نیوش کانوں تک رسائی نہیں۔ اور بایزید (بسطامیؒ) کے زمزمے سبحانی مااعظم شانی) کا اس کے لب حق گو کے ساتھ کیا کام! اگر دوسرے شراب پینے والے تھے تو (ہمارا) آقا مے خانہ نوش ہے۔ جو دوسروں کے لیے خم ہے وہ اس کے لیے جام ہے۔ سب میں موجود ہوتے ہوئے سب سے الگ اور تمام خلق کے ساتھ خلق کی طرح موجود۔ جب سے میں اس کا ہمسایہ ہوا ہوں آسمان والے میرے سائے میں ہیں۔ اور جب سے اس دروازے کا خاک نشیں ہوں فرشتے میرے مرتبے پر رشک کرتے ہیں۔ روشن دل لوگوں کے دل و دیدہ میں میری جگہ ہے اور چاند تاروں پر میرے قدم ہیں۔ اس سایۂ دیوار کی گوشہ نشینی اور خوشہ چینی میں رحمتِ خداوندی کی پہلی آیت جو عالم بالا سے مجھ پر نازل ہوئی خدا شناس بادشاہِ جہاں کی زمیں بوسی کی سعادت کا حصول تھا۔ اقبال نے میری طرف رُخ کیا اور نصیبہ جاگ اُٹھا۔ حور نے مبارک باد کہا۔ رضوان میرا رضا جُو ہوا۔ آسمان نے اپنی گزشتہ کوتاہیوں کی معافی مانگی۔ زمانے نے سابقہ حالات کے بارے میں عذر پیش کیا۔ فرد۔

نو میدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر

نو میدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

اے خدا تجھ سے ناامید ہونا کفر ہے اور تو کفر سے راضی نہیں (اس لیے) میری ناامیدی نے مجھے پھر تیرا امیدوار بنا دیا ہے۔

میرے جسمِ خاکی میں پیکر گرد باد کی طرح جان نہیں ہے۔ یہی دو ایک دم کی آوارہ گردی کا تماشا رکھتا ہے۔ شاید میں گلشنِ تصویر کا بلبل ہوں کہ بوئے گل پر زمزمہ سنج نہیں ہو سکتا یا سبزۂ جوہرِ شمشیر ہوں جو ہوا کی مستانہ چال سے نہیں لہلہا سکتا۔ پیوندِ نشاط کو ٹوٹے مدت ہوگئی (مگر) دل سے خون اسی طرح جاری ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پیوند کس قدر مضبوط تھا اور اس کو کتنے زور سے توڑا گیا ہے۔ ایک رات میں نے دلِ دیوانہ سے جو مجھ سے کسی قدر ہوشیار ہے۔ کہا ''اے دل! اگر تو مجھے بولنے کی طاقت دے تو میں بادشاہ کی ارم سامان بارگاہ میں عرض کروں کہ جہاں پناہ! میں آئینۂ راز ہوں۔ مجھے صیقل کیجیے اور سخن طراز ہوں میری پرورش فرمایئے۔ (دل نے کہا) اے نادان! یہ بات دوسرے موقع کی تھی اور وہ موقع گزر گیا۔ اب اگر کہہ سکتا ہے تو یہ کہہ کہ ''میں زخمی ہوں، میرے زخموں پر مرہم رکھنا چاہیے اور مردہ ہوں، مجھے زندگی بخشنی چاہیے۔ رباعی

شاہا ہر چند وایہ جوی آمدہ ام

دانی کہ چہ مایہ نغز گوئی آمدہ ام

آبم کہ محیط بجوی آمدہ ام

رنگم کہ بہار را بروی آمدہ ام

ترجمہ: اے بادشاہ! میں اگر چہ حاجت مند ہوں۔ مگر تو جانتا ہے کہ کیسا خوش بیان ہوں۔ وہ پانی ہوں کہ دریا کو نہر میں لے کر آیا ہوں۔ وہ رنگ ہوں کہ بہار کے چہرے پر کھل رہا ہوں۔

جیسا میں تیرے زمانے میں ہوں اگر دانش مند جمشید کے زمانے میں ہوتا تو جمشید زمانے کی تعریف کرتا اور جس طرح میں بادشاہ کا مداح ہوں۔ اگر مبارک فریدوں کی مدح کرتا تو فریدوں، چرخ و ستارہ کے قربان جاتا۔ اس انجمن میں جہاں زردشت نے آگ روشن کی اور ژند لایا اگر میں اس نفسِ آتش بار کے ساتھ وہاں ہوتا تو آگ میرے خوف سے روشن نہ ہوتی۔ اور میرے بیان کی دل فریبی کے مقابلے میں ژند کے سننے کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا۔ میں اس خوش نصیبی پر کہ تجھ جیسا کارفرما آقا رکھتا ہوں جتنا بھی اپنے اوپر ناز کروں بجا ہے۔ تیرے قربان! تو بھی اس گرمیِ ہنگامہ پر ناز کر کہ غالب جیسا آتش نوا غلام رکھتا ہے۔ اگر تو (میرے) ہنر کے لائق حقِ التفات ادا کرنا چاہتا ہے تو آنکھ میں پتلی کی جگہ میرے لیے خالی کر دے۔ اور دل کا دروازہ میرے لیے کھول دے۔ کہتے ہیں حضرت صاحب قرانِ ثانی (شاہ جہاں) کے دورِ جہانبانی میں اس دریا دل بادشاہ کے حکم سے کلیم کو سو دفعہ چاندی اور سونے اور لعل و گوہر میں تولا گیا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اہلِ بصیرت کو حکم دے کہ وہ محنت اور کوشش سے بیزار نہ ہوں اور ایک دفعہ میرے کلام کا کلیم کے کلام سے موازنہ کریں۔ نظم۔۔

بچشم کم منگر گرچہ خاکِ راہِ توام

کہ آبروے دیارم دریں خلافت گاہ

کمال بیں کہ بدیں غصہ ہاے جانفرسا

ہنرنگر کہ بدیں فتنہ ہاے طاقت کاہ

مربیِ سخنم من بمایہ داری فکر
ز نطق من بودش عیش ہاے خاطر خواہ
باخذ فیض زمبدافزونم از اسلاف
کہ بودہ ام قدری دیر تر دراں درگاہ نزول من
بجہاں بودیک ہزار و دویست
ظہور سعدیؔ و خسرو بہ شش صدو پنجاہ
سخن ز نکتہ سرایانِ اکبری چہ کنی
چو من بخوبی عہد توام ز خویش گواہ
کنوں تو شاہی و من مدح گو تعال تعال
گزشت دورِ نظیریؔ و عہدِ اکبرشاہ
بفنِ شعر چہ نسبت بمن نظیری را
نظیر خود بسخن ہم منم سخن کوتاہ

ترجمہ: مجھے حقارت سے نہ دیکھ! اگرچہ میں تیرے راستے کی خاک ہوں۔ مگر اس دارالخلافہ میں ملک کی آبرو ہوں۔

میرے کمال کو دیکھ کہ اُن جانفرسا آلام کے باوجود! ہنر کو دیکھ کہ ان طاقت رُبا فتنوں کے ہوتے ہوئے! میں فکر وخیال کی سرمایہ داری کی وجہ سے مربیِّ سخن ہوں کہ میرے نُطق سے اس کو خاطر خواہ عیش حاصل ہے۔

مبدءِ اولیٰ سے فیض حاصل کرنے میں اپنے اسلاف سے سبقت لے گیا ہوں، اس لیے کہ میں ان کے مقابلے میں اُس درگاہ (مبدءِ اولیٰ) میں زیادہ دیر تک رہا ہوں۔ میں دنیا میں بارہ سو ہجری میں آیا ہوں اور سعدیؒ و خسروؒ کا ظہور چھ سو پچاس میں ہوا ہے۔

اے بادشاہ تو اکبری دور کے شاعروں کا کیا ذکر کرتا ہے جب کہ میں تیرے زمانے کی خوبی پر گواہ ہوں۔

آ۔آ۔اب تو بادشاہ ہے اور میں تیرا مداح۔ دورِ نظیریؔ اور عہدِ اکبر شاہ گزر گیا! فنِ شعر میں نظیریؔ کو مجھ سے کیا نسبت، شعر میں خود اپنا نظیر میں آپ ہوں اور بس۔ اپنے کلام کی تعریف میں میری پریشان گوئی اگر لاف وگزاف نہ ہو تب بھی سچ بات کو گستاخانہ انداز میں پیش کرنا بھی تو انصاف نہیں ہے! کیا میں وہ نہیں ہوں کہ ہمیشہ اپنے آپ کو ہیچ سمجھتا رہا اور کبھی اپنے اوپر کمال کا گمان نہیں کیا؟ (مگر) اس بلند نظر کے پسند کر لینے کی سرمستیِ ذوق نے جو تیرا برگزیدہ ہے۔ مجھے اپنے آپ میں نہ رہنے دیا اور خامہ بے پرواز کو اس روش و آہنگ کے ساتھ رقص و سرود میں لے آیا۔ شہنشاہ کی مہربانی کی کشش نے کہ قبولیتِ الٰہی کے اقبال کا فرمان ہے۔ اس زمانے میں کہ دانش کیمیا ہے اور دانشورِ عنقا ایک ایسے یگانہ (روزگار) کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے کہ آفتاب کی پوری گردش اس کی جگہ پر کسی اور کو نہیں لاسکی اور فرزانگی و واقفِ کار ہونے میں اس کے ہمتا کی چرخ و ستارہ سے امید نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ ایسا ہے کہ جب تو شکار کے شوق میں گھوڑا دوڑاتا ہے تو طریقۂ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے گھوڑے کے پیچھے رہتا ہے اور جب تو جہاد کے لیے لشکر کشی کرتا ہے تو جاں فشانی کے جوہر پیش کرنے کے لیے تیرے آگے آگے دوڑتا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ تارِ جادہ کی نبض دیکھ کر خاک کے سکتے کی حقیقت جان لیتا ہے۔ اور چاند کے چہرے کو دیکھ کر دوار چرخ کا سبب معلوم کر لیتا ہے۔ ہر چند کہ دوسرے اس باب میں دم نہیں مار سکتے (مگر) ہمارا آقا جانتا ہے اور بیان (بھی) کرسکتا ہے کہ پھول کی کلی باوجودیکہ اسے خفقان نہیں ہے کیوں اپنے بدن کے کپڑے پھاڑتی ہے اور نرگس باوجودیکہ اس کو خناق نہیں ہے کیوں نئے سے پانی پیتی ہے۔ مردانگی، پارسائی اور دانش و داد کے آئینے سے، غصّے اور شہوت رانی کے زنگ کو ایسا صاف کر دیا ہے کہ حکمت و عدالت کا چہرہ داد و دانش کے آئین کے مطابق اس کی رائے کے آئینے کے سوا اور کہیں نظر نہ آیا۔ شاید یہ چار پُرشکوہ صفات، کہ جن کو ہم شجاعت، عفّت، حکمت اور عدالت کہتے ہیں، اس کے پیکر کے چار عناصر ہیں۔ اب میں آبِ حیات سے دہن کو صاف کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ وہ عقل مند کون ہے کہ جس کے لیے یہ تعریف سزاوار ہے؟ مبارک وزیرِ کار آگاہ، ستودہ مذہب اور گرامی راز داں، خوش اخلاق ضمیر کے اعتبار سے لوحِ محفوظ کی مثال اور گراں مایہ ہونے میں عقلِ اول کا ہمسر!۔ کیواں جیسا بلند خیال، مشتری جیسی عقل و دانش والا، برجیس ہوش، عطارد جیسا طاقت کا مالک، ارسطو مرتبہ، افلاطوں کی سی عقل والا، احترام الدولہ، معتمد الملک، حاذق الزماں، عمدۃ الحکما، حکیم احسن اللہ خاں بہادر ثابت جنگ۔ مسیح کے اپنے دم سے مردے کو زندہ کرتے تھے۔ اگر زندہ آدمی کی عقل بڑھانا جانتے تو اس بلند مرتبہ، ہمہ داں، توانا نفس کے ہم نفس ہو سکتے تھے اگر لوٹ آنا آزاد روحوں کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں۔ اور ایک کی زندگی کا دوسرے کو ملنا شریعت میں روا ہوتا تو میں کہتا کہ بادشاہ، سکندر ہے اور حکیم احسن اللہ خاں ارسطو۔ یقیناً (یہ وزیر) بادشاہِ

جہاں کی دنیا میں بلند نامی چاہتا تھا، اس لیے (اس نے) مجھ جیسے کو کہ جادو بیانی میں شہرۂ آفاق ہوں تاریخ نویسی پر مامور کر دیا۔ میں بھی اس خیال سے کہ اس بیدار مغز کے دل و زباں بادشاہ کے دل و زباں کے آئینہ دار ہیں۔ یہ جانتا ہوں کہ جو کچھ عمدۃ الحکما نے اس بارے میں فرمایا ہے وہ فرمانِ بادشاہ ہے۔ فرد۔

پادشا ہاں را ثنا گفتن نہ کارِ ہر کس است

دیدہ در شاہی کہ کار گفتن انداز و بمن

بادشاہ کی تعریف کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے (اس لیے) وہ بادشاہ دانش مند ہے جس نے مدح کا کام میرے سپرد کیا۔ نامہ نگار کردار گزار (غالبؔ) کو توفیقِ الٰہی کی مدد سے اس خدمت کے انجام دینے کی سعادتِ جاودانی اور بادشاہ کو اس تحریر کی سیاہی کے سائے میں، کہ ظلماتِ آبِ حیواں ہے، حیاتِ ابدی حاصل ہو۔

☆☆☆☆☆

سببِ تالیفِ کتاب

ایک دن تھا کامیاب اور ایک صبح تھی دل افروز۔۔ ہوا چل رہی تھی اور سبزہ لہلہا رہا تھا۔ بلبل نغمہ سرا تھی اور زاہد تسبیح پڑھ رہے تھے۔ راہ رَو اسبابِ سفر باندھے ہوئے اور رات میں سفر کرنے والے ٹھہرے ہوئے۔ وہ دن مبارکی کی وجہ سے سعدِ اکبر کے نام سے موسوم اور پنجشنبہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اور ۲۳ رشعبان ۱۲۶۶ھ مطابق ۴ رجون ۱۸۵۰ء تھا۔ آفتاب خرگاہِ ماہ (برج ثور) میں مہمان تھا اور چاند نشیمن زہرہ (برج حوت) سے مہمان کو نگاہِ محبت سے دیکھ رہا تھا۔ کیوان برج حمل میں رہ نورد اور مُشتری برج سنبلہ میں خراماں۔ مریخ برج اسَد میں زہرہ کے ساتھ اور عطارد جوزا میں تنہائی پر شاداں۔ شہنشاہ ایسے دبدبے کے ساتھ کہ گویا آفتاب ہے۔ بیت الشرف میں تخت پر جلوہ افروز اور میں ایسی خوشی کے ساتھ کہ گویا عطارد ہوں، صمیمِ دل سے روبرو کھڑا ہوں۔ شاہی کارکن مجھے بادشاہ کے حکم سے خلعت خانے میں لے گئے اور میرے قامت کو خلوت شش پارچہ سے آراستہ کر کے سلام گاہ میں لائے۔ دنیا و دیں کے بادشاہ نے اس بخشش آئیں ہاتھ سے کہ جس کی ہتھیلی ایسا دریا ہے کہ سات دریا اس کے مقابلے میں کفِ آب (جھاگ) ہیں۔ جگر گوشہ ہائے معدن یعنی جیغہ اور سرپیچ میرے سَر پر باندھا اور رگِ جانِ ابرنیساں یعنی موتیوں کی حمائل میری گردن

میں ڈالی۔ نقیب مبارک سروش نے بادشاہِ سیارہ سپاہ کے ابرِ خامہ کی رگوں سے ٹپکے ہوئے موتی بساطِ بارگاہ کے گوشے پر بکھیر دیے۔ اور غالب سخن سرا کو نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب سے پکارا۔ اس خطاب سے جو میں نے ذرّہ نواز آفتاب سے پایا۔ کیوں کر کہوں کہ اپنے آپ کو آفتاب کے برابر، البتہ عطارد کا ہم پلّا پایا۔ شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا فرمان میرے نام صادر ہوا۔ اور دیر چرخ (عطارد) کو تا کہ رشک سے اس کا دل خون نہ ہو، میری پیشکاری پر مامور کردیا۔ نامہ نگار کا بھی ایسا ہی ارادہ تھا اور حکم بھی ایسا ہی ہوا کہ اس خرد افزا کتاب کا آغاز بادشاہ رستم سرہنگ، حاتم وظیفہ خوار، دارا دربان، سکندر پیشکار۔ نو آسمانوں اور سات ستاروں کے منظورِ نظر اور شش جہت میں ساتوں ولایتوں کے حاکم، صاحب قرانِ روشن گہر، امیر تیمور نام جو، نام آور کے (نام سے) جو زندگی میں کیوان کے برابر بلند محل اور ستاروں کی جیسی انجمن رکھنے والا تھا اور مرنے کے بعد آبِ کوثر سے سیراب ہونے والا اور بہشت میں اقامت گزیں ہے، اس طرح بیان کیا جائے کہ اس فردوسی کا شاہنامہ، جس کے قلم نے پورِزال (رستم) کی درازدستی بیان کی ہے، تقویمِ پارینہ۔ اور اس نظامی کا شرف نامہ (سکندر نامہ) جس کی صریرِ خامہ خضر و سکندر کے قافلے کے لیے بانگِ درا ہے۔ کاغذ تو تیار ہو کر رہ جائے، مگر اس سے پہلے کہ بادشاہِ جہاں کے مبارک اسلاف کے مبارک حالات قلم بند کروں۔ یکا یک حکم صادر ہوا کہ کتاب میں ابتدائے آفرینش سے کلام کا آغاز کیا جائے اور اس رفتار (تحریر) میں اپنا طریقہ یہ بنائے کہ جو کچھ وزیر دانا کہ دانش کا خزینہ دار ہے۔ فرد۔۔

لفظ و معنی را بدانش دادرس

احترام الدولۂ عیسیٰ نفس

لفظ و معنی کا دانش مندی کے ساتھ حق ادا کرنے والا، احترام الدولہ، عیسیٰ نفس، اس کو بتائے اس کے بیان کرنے کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھے اور اس خرداندوز (احترام الدولہ) کے جمع کردہ (حالات) کی ابتدا اس جنبشِ نظر افروز سے ہوئی ہے جو دریائے نور سے بتقاضائے حُبِ ظہور پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ رازگو دانشور ایوانِ سخن کو بلندی میں چرخِ بریں تک لے گیا ہے اور اس صیدگاہ (کتاب) میں ابتدائے افلاک سے لے کر اس والیِ عصر کے آستانِ سپہر نشان تک کے اسرار کی شرح بیان کی ہے کہ جس کی محبت کے علَم کے زیرِ سایہ ہم نے پرورش پائی ہے۔ البتہ عقل نے، کہ خالق عالم نے حیوانِ ناطق (انسان) کے چہرے کو اس کے غازے سے روشن کیا ہے۔ مجھے یہ تعلیم دی کہ جس وقت گریبانِ فکر سے سر نکالوں تو حالات کو دو حصّوں میں لکھوں۔ خواہ

ان دوحصّوں کو، جن کا دیباچہ ایک ہی ہوگا، ملا دیں خواہ ان کی الگ الگ شیرازہ بندی کریں۔ پہلا نصف ابتدائے آفرینش سے شہنشاہ آسمان خرگاہ، نصیرالدین ہمایوں بادشاہ کی جہاں گردی و جہاں گیری تک اور دوسرا نصف آسمانِ عزّ وجاہ کے آفتاب جہاں تاب، جلال الدین اکبر بادشاہ کی جہانگیری سے اس شہنشاہ موید من اللہ کی جہاں آرائی تک، جس کی مدح میں راز دانوں کی زباں پر ہمیشہ یہ فرد رہتی ہے۔

بداں نمط کہ ز آدم محمدؐ است مراد
زپشتِ کار تمر خاں بہ تست روی حکیم

جس طرح آدم سے ذات محمدؐ مراد ہے اسی طرح تیمور کی پیدائش سے خدا کا منشا تیرے وجود کے ظہور سے تھا۔ اور خدا خدا کرنے والوں کو اس کی (درازئ عمر) کی دعا میں اس مصرعے کے سوا اور کسی طرح تسلی نہیں ہوتی کہ تا خدایا شد بہادر شاہ باد۔ ترجمہ: جب تک خدا ہے بہادر شاہ ظفر بھی رہے

جلوہ راز کے دیکھنے والوں کو بینش افرزی نصیب ہو کہ ہم اس کتاب کو پرتوستان کے نام سے موسوم کر کے پہلی نگارش کا نام 'مہرِ نیم روز' اور دوسری گزارش کا 'ماہِ نیم ماہ' رکھا ہے اور جہاں کہیں فصل واقع ہوگی تو اس کو انداز جداگانہ کے ساتھ پرتو سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس مقام پر کہ مہر اور پرتو کا ذکر ہو رہا ہے۔ ذرّے کی طرف اعتنا نہ کرنا آئینِ انصاف نہیں ہے۔ میں اگر بے راہ چلوں تو نکتہ چینی نہ کیجیے کیوں کہ میرا راستہ طول کی وجہ سے عرض کے ساتھ جنگ آزما ہے۔ نگاہ جادۂ راہ سے لگی ہوئی ہے اور اقبال آگے آگے چل رہا ہے اور ہمت ساتھ ہے۔ اس راہ سے کہ سوائے افزائش آگہی اور کوئی مقصد نہیں ہے ان دو ایک جولانیوں سے گمراہی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ (مجھ سے) پہلا، جس کی تعریف کرنے والوں کے شور سے آسمان پُر صدا ہے۔ یا نہیں جانتا تھا یا خود نہیں کیا کہ داستان سرائی کے نمکِ گفتار کو غزل کی شیریں ادائی کے ساتھ ملائے اور سازِ سخن سے ایسی تلخ نوا پیدا کرے کہ (شنیدن) کے مغز جان میں آگ بھڑکا دے۔ رہا میرا معاملہ تو عمر بھر شراب نوشی کرتا رہا ہوں اور اس مستی میں بجز غزل کے (اور کچھ) نہیں کہا ہے اور اگر کسی قدر جادۂ نثر پر قدم رکھا ہے تو اس رفتار میں بھی مستانہ چال سے (جو غزل میں رہی) راستہ طے کیا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں کہ دل پاش پاش۔ ہے اور فکر سرگشتہ اور ہوش سرنگوں اور دماغ گویا ہے ہی نہیں۔ جسم روح کی ناسازی کی وجہ سے تباہ ہے اور روح جسم کی علالت کے سبب سے درماندہ۔ اگر ایک صفحہ لکھتا ہوں تو اس سے پہلے کہ وہ صفحہ ختم ہو اور ورق گردانی کی نوبت آئے انگلیاں باہم مل جاتی ہیں اور قلم ہاتھ سے گر جاتا

ہے،خون رگوں میں جل چکا ہے اور نگاہ آنکھوں میں جل چکی ہے اور سانس لب پر اور مغز استخواں میں جل چکا ہے۔ زمانہ چاہتا ہے کہ افسانہ گوئی میں میرے ساز کی آواز کا اندازہ اور میرے طرزِ نگارش کے مرتبے کو آزمائے:۔۔نظم۔۔

دریغا کہ در ورزشِ گفتگوئی
بہ پیری خود آرائی آورد روی
بہ برنائیم روئی پیری سیاہ
ز مو بود بر فرق مشکیں کلاہ
کنوں نیست ظلّ ہمایم بسَر
بہ پیری فتاد ایں ہو ایم بسر
شبابم کہ تاب و تبی بودہ است
ز شب ہائے جوزا شمی بودہ است
بداں منکہ دارم شماری دراز
شب کوتہ و روزگاری دراز
دریغ از ترقی معکوسِ من
کہ باشد سرِ من بپا بوس من
ز سَربادِ پندار بیروں شدہ
سہی سرومنِ بید مجنوں شدہ
بود قد خم گشتہ چوگان من
سخن گوئی و اندیشہ میدان من
سخن را بداں گونہ دانم سرود

کزیں نیز خوشتر توانم سرود

ترجمہ: افسوس کہ سخن آرائی کے جوہر دکھانے کا بڑھاپے میں موقع ملا!

میری جوانی میں بڑھاپے کا منہ کالا تھا۔ (کالے بالوں کی بدولت) سر پر مشکیں کلاہ تھی۔

اب کہ میرے سر پر ہما کا سایہ نہیں ہے۔ بڑھاپے میں یہ سودا (تاریخ نگاری) سر میں سمایا ہے۔

جوانی میں جب کہ تاب وتوانائی حاصل تھی (ہر رات) جوزا کی راتوں میں سے ایک رات تھی۔

میں کہ قصۂ دراز رکھتا ہوں، یقین کرو (اب) میری راتیں چھوٹی ہیں اور زمانہ دراز ہے۔

اپنی ترقیِ معکوس پر افسوس کرتا ہوں کہ میرا سر میری پابوسی کر رہا ہے۔

سر سے ہوائے غرور نکل گئی ہے اور یہ سروِ سہی بیدِ مجنوں کی طرح جھک گیا ہے۔

میں سخن کو اس طرح بیان کرنا جانتا ہوں بلکہ اس سے بھی بہتر اسلوب کے ساتھ۔

ہاں اے اہلِ بصیرت! قلم کی جو یہ عمدہ روش میری انگلیوں میں ہے اگر فروتنی (عجز وانکسار) کے فرسودہ طریقے سے قطع نظر کر کے اہلِ بینش سے داد چاہوں تو یہ دانش مندی کی وجہ سے ہے نہ کہ نخوت وتکبر سے۔ کالا شناسی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لوگ اپنی متاع کی خوبی کو نظر سے گرادیں اور نہ بہ کار چلانے والے کا یہ دستور ہے کہ اس شکل کا جو اس نے کھینچی ہے عاشق نہ ہو جائے! کیا مانی اس نقش کو جسے وہ کھینچتا تھا، معجزہ نہیں سمجھتا تھا؟ اور کیا آزر اس بت کی، جس کو وہ تراشتا تھا پرستش نہیں کرتا تھا؟ میں خدا کا سپاس گزار بندہ نہ ہوں گا اگر قلم کی ہر جنبش پر تعریف نہ کروں اور اپنے کلام کا ہر خیال پر احسان نہ مانوں۔

کبک اور تدرو کی چال دل ہاتھوں سے چھین لے مگر ایسے رقصاں بتِ رعنا کا خرام سرمست (بھی) نہ کرے!۔ حاشا کہ قلم کی رفتار صفحۂ کاغذ پر اس قدر دل کو لبھانے اور ذوق پیدا کرنے والی ہو! (یہ قلم) عطارد ہے کہ برج سنبلہ میں سرمستی کی حالت میں خودنمائی کے طور پر ناز سے خراماں ہے۔ یہ عربی آمیز فارسی جو عربوں کے عجم پر غالب آجانے کے زمانے سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک خزانہ دربستہ تھی کہ میرا قلم اس کے قفلِ در کے لیے کلید بن گیا۔ پرویز کہاں ہے تاکہ دیکھے کہ میں اس رہ روی میں کس راستے پر چلا ہوں! اور بہرام کہاں ہے جو اندازہ کرے کہ میں نے مرتبۂ سخن کو کہاں سے کہاں پہنچادیا ہے۔ فرد

خسروی بادہ دریں دَور اگر می خواہی

پیش ما آئی کہ تہ جرعۂ از جامی ہست!

اگراس دور میں خسروی شراب چاہتے ہوتو میرے پاس آؤ کہ اس شراب کے ایک جام کی ذراسی تلچھٹ باقی ہے۔

خودستائی کو چھوڑتا ہوں اور بندِ نخوت کو توڑتا ہوں۔ افسوس ہے اس زمانے پر کہ عادت کے اعتبار سے ناسازی میں اور کام کے اعتبار سے کھیل میں گزرا۔ اور فریاد ہے اس ظلم سے جو غصہ وشہوت کے جوش میں جان اور عقل پر ہوا۔ اس تحریر کے کارفرما کا احسان مند ہوں کہ اس اندازِ نگارش کو سنوارنے میں کہ جس کے لیے میں نے اپنے آپ کو سائے کی طرح زمین سے ملادیا ہے تب کہیں سنوار سکا ہوں، اس نقش کے بنانے میں کہ آنکھ اور دل اور نگاہ اور نفَس کو ایک کردیا ہے تب کہیں بنا سکا ہوں۔ ہاتھ دوسرے کاموں سے کوتاہ ہے اور دل دوسرے فکروں سے آزاد۔ نامہ نگار جو مقصد کو انجام تک پہنچانے سے پہلے درِدل کہنے کی طرف مائل ہوگیا تھا پھر انجام کلام کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور جو راستہ اس کو بتایا گیا ہے اس پر چلتا ہے۔ دیکھنے والے ہمہ تن چشم اور سننے والے سراپا گوش بن جائیں۔

☆☆☆☆☆

غالبؔ کی فارسی نظم

(قلعے سے متعلق)

غالبؔ نے اکبر شاہ ثانی سے لے کر ولی عہد مرزا فخرو تک مغل بادشاہوں اور شاہزادوں کی مدح میں جتنے قصیدے یا مدحیہ رباعیاں اور قطعات کہے ہیں، وہ یہاں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

در مدحِ حضورِ والا

خلد اللہ ملکہ و سلطانہ

زہی ز خویش نشانِ کمالِ صنعِ الٰہ
سراجِ دینِ نبی بوظفر، بہادر شاہ
محیطِ بخشش و دریا کف و سحاب نوال
قمر لوای و فلک خرگہ و ستارہ سپاہ
رئیسِ تاجوران خسروِ جہان داور
دلیلِ راہ روان، مرشدِ خدا آگاہ
بوی نیازِ سپہبد ز پنجمین منظر
بوی نیایشِ کیوان ز ہفتمین خرگاہ

ز خاکِ رہ گزرش سرمہ آرزوی عیون
برآستانِ درش سجدہ آبروی جباہ

بہ فیضِ آگہی آئین شناسِ سیرو سلوک
بفرِّ خسروی ازرش فزای دولت و جاہ

دمِ مراقبہ صورت نمای جوہرِ عقل
کہ مشاہدہ نیروفزای نورِ نگاہ

ز حق عطیہ پزیرد چو ماہتاب ز مہر
بہ خلق بہرہ رساند چو آفتاب بماہ

بکارہای جہان حکمِ محکمش نافذ
ز رازہای نہان رای روشنش آگاہ

ز عدلِ او کہ باضداد بخشد آمیزش
بچاکِ شعلہ زند بخیہ سوزنِ پرِکاہ

ز قہرِ او کہ بگردن کشان دہد مالش
بگوشِ شیر بود حلقہ از دمِ روباہ

فلک بہ لرزہ در، از وی، ز دستبرد علَم
زمین بہ زلزلہ از وی، ز رستخیزِ سپاہ

بیزمِ او کہ سلاطینِ دہر راست مطاف
بعہدِ او کہ سنین و شہور راست پناہ

کرا مجالِ نشستن بغَیر نقشِ مراد
کجا نشان شکستن بغیر طرفِ کلاہ

چو او نکرده کس از اہلِ دین بفرشِ حصیر
نشاطِ شاہی و فرماندہی، خداست گواہ

چو او نگفتہ کس از خسروان بروی سریر
حدیث فقر و فنا لا الہ الاّ اللہ

شہنشا! ز غمِ دوریِ درت، کارم
بدان رسیدہ کہ بیمرگ جان دہم ناگاہ

نہ جویم ار بدرت راہ، رحم کن نہ عتاب
درینکہ طالعِ من بد بود مرا چہ گناہ

کجاست ارزشِ آنم کہ بر بساطِ قبول
بہ لب نوا دہم از پای بوسِ شاہنشاہ

ز نقشِ پای توام بوسہ بس بود آری
درین ہوس چو گدایان گرفتہ ام سرِ راہ

ببارگہ نہ رسم، خانۂ سپہر خراب
ندیمِ شہ نشوم، روی روزگارِ سیاہ

ز شاہ، بہرۂ من، سوختن بداغِ فراق
ز دہر، حاصلِ من، زیستن بحالِ تباہ

چہ دل نہم بہ گہرپاشیِ سخن، چو مرا
ہزار آبلہ بر دل بود ز گرمیِ آہ

چہ سر کنم روشِ مدح گستری، چو مرا
ببزمِ خسروِ گیتی ستان نباشد راہ

ز کار رفته دل و دستِ من چنانکه مرا
نمانده شادیِ پاداش و رنجِ باد افراه

نه ازتو لطف و نه از حق مدد، زہی حرمان
نه تابِ شکوه، نه جای سخن، معاذ الله

نباشدم صله مقصود، مدح خوانِ توام
بدین ذریعه مگر یادم آوری گہ گاه

وگر عطیه فرستی، شگفت هم نبود
که می رسد ز نمِ ابر تازگی به گیاه

بچشمِ کم منگر، گرچه خاکِ راهِ توام
که آبروی دیارم درین خلافتِ گاه

کمال بین که بدین غصه های جانفرسا
هنر نگر که بدین فتنه های طاقت کاه

مربیِ سخنم من، بمایه داریِ فکر
ز نطقِ من بودش عیشهای خاطرخواه

عبارتم به طراوت چو لاله در بستان
معانیم به لطافت چو باده در دی ماه

باخذِ فیض ز مبدا فزونم از اسلاف
که بوده ام قدری دیر تر، بدان درگاه

نزولِ من بجہان بعد یک ہزار و دویست
ظہورِ سعدی و خسرو به ششصد و پنجاه

سخن ز نکتہ سرایانِ اکبری چہ کنی؟
چو من بخوبیِ عہدِ توام ز خویش گواہ

کنون تو شاہی و من مدح گو، تعال تعال
گزشت دورِ نظیری و عہدِ اکبر شاہ

بہ فنِ شعر چہ نسبت بہ من نظیری را
نظیرِ خود بسخن ہم منم سخن کوتاہ

سخن سرائیِ غالب سپس برسمِ دعاست
اجابت از حق و خواہش ز بندۂ درگاہ

طرب بطبعِ تو شامل چو رنگ با رخِ گل
بقا زخصمِ تو زائل چو خندہ از لبِ چاہ

☆☆☆☆☆

در مدح سلطانِ عہد، ادام اللہ امرہ و سلطنتہ

ردیفِ شعر ازان کردم اختیار گرہ
کہ از منست بر ابروی شہریار گرہ

گرہ کشای رموزِ خرد بہادر شاہ
کہ پیشِ ناخنِ تدبیرِ اوست خوار، گرہ

زہی روائیِ فرمان کہ در کفش پیہم
دود چو گوہرِ غلطان بروی تار گرہ

ز بسکہ زرشدہ خوار از کفِ زر افشانش
ز کیسہ ساختہ پہلو تہی ، ز عار گرہ

ز ہولِ حملۂ او بسکہ در گلوی عدو
شدست گریہ بمیدانِ کارزار گرہ

عجب مدار کہ چون خون روان شود بر خاک
دمد بجای حبابش ز جویبار گرہ

فلک ، بجادۂ راہش گہر فشاند و بخت
بفرقِ رشتۂ عمرش کند تار گرہ

ازانکہ رشتۂ عمرش شعاعِ خورشیدست
شدست بسکہ درین رشتہ تابدار گرہ

عجب مدار، بخوبی اگر زند پہلو
بہ انجم و بہ گہرہای شاہوار گرہ

بران سرست کہ جای دگر قدم ننہد
گرفت بسکہ درین رشتہ اعتبار گرہ

جہانیانِ بہ شما مژدۂ کشایشِ کار
کہ ہیچگاہ نیفتد دگر بکار گرہ

ز بسکہ بستہ بدین رشتہ دل روا باشد
ز رشتہ تازہ گردد گر آشکار گرہ

چو شد وظیفہ ز روزِ ازل کہ سال بسال
رسد برشتۂ عمرش ز روزگار گرہ

گمان برشتۂ عمرش کنم کہ سر تا سر
نشستہ است گرہ را در انتظار گرہ

ایا شہنشہِ کشور کشای، دشمن بند!
ز بندہ در خمِ ابرو روا مدار گرہ

کہ چون بدین صفت اندر ضمیر، من گزری
بہ پیچ و تاب دلم را دہد فشار گرہ

دلست تنگ ازان رو مشوشم، کہ مباد
شود ز تنگیِ جا در دلم فگار گرہ

شدست کار گرہ در گرہ چنانکہ اگر
شوم غبار، شود در ہوا غبار گرہ

ز کارِ خویش چه نالم که دستِ چرخ دران
بساز دست و زند صد هزار بار گره

ازین گره که بر ابروی تست در تابم
که آه در چه محل یافتست یار گره

زری ز خشم بر ابروی و غافلی که مرا
بسانِ رشته ز غم می کند نزار گره

کنم بیزمِ تو سازِ غزل بلند آواز
فگنده است بدل طرحِ خار خار گره

زهی بحلقهٔ مویت نهاں هزار گره
فتاده مست بهر گوشه و کنار گره

چو وا نشد بہ منش دل، خود از میان رفتم
گزاشتم بدلِ دوست یادگار گره

چو رشته پیچ خورم چون هنوز جا خالیست
اگرچه رفته ز بندِ قبای یار گره

بدین تحمل و طاقت که لرزه در گیرد
بسانِ رشته بمن گر شود دوچار گره

مراست پویه بسر، شرط و در ره افتادست
بتارِ جادهٔ این ره ز کوهسار گره

بدلکشایِ گفتارِ من که غالب را
مزن برشتهٔ امید زینهار گره

ازین گره که بر ابرو زدی چرا ترسم
که در دلت ز صفا نیست پائدار گره

نشاطِ سالِ نو و جشن، این همایون سال
برد ز ناصیۂ شاهِ نامدار گره

ز فرطِ گرمیِ هنگامه خوشدلم که مگر
مرا برون جهد از دل سپندوار گره

گره اگرچه بتارِ نفس نمی سازد
بود برشتۂ عمرِ تو سازگار گره

ز سلکِ رشتۂ عمرِ تو آن طراوت یافت
که شد به حسن، جگر گوشۂ بهار گره

بهار راست بدین رشتہ سر، شگفت مدار
بجاے غنچه دمد گر ز شاخسار گره

ازان برشتۂ عمرِ تو میرسد هر سال
که عہدِ پاسِ وفا بستہ استوار گره

ز بسکه رشتۂ عمرِ تو در تنش جان شد
برشتہ ہستیِ خود را دہد قرار گره

ز ہمنشینیِ بندِ قبای محبوبان
عجب بود نه گزیند اگر کنار گره

سحر برسمِ دعا خواستم که آن بادا
که بشمرند درین رشتہ صد ہزار گره

مسیحانِ بلند آسمان، ندا دادند
که صد ہزار گرہ، بلکہ بے شمار گرہ

چنانکہ کار بدانجا رسد کہ بہر نشان
نیابد آن کہ بجوید ز روزگار گرہ

☆☆☆☆☆

در مدحِ بہادر شاہ

خورشید بہ بیت الشرفِ خویش درآمد
ز انسان کہ شہنشاہ بہ اورنگ برآمد

دارای فریدون فرِ فرزانہ فرخ
کز فرِ فراوان لقبش بوظفر آمد

ہمتای جہاندار نہ بینی بجہان در
کز فرہ و فرہنگ جہانی دگر آمد

در حضرتِ شاہِ ہمہ دان و ہمہ آرای
کاندر ہمہ جا در ہمہ بخشی سمر آمد

خورشید، بدریوزۂ دیہیم رخ آورد
بہرام، طلبگارِ کلاہ و کمر آمد

از پیش گہِ مہر بود پیشکشِ شاہ
ہر گوہرِ رخشندہ کہ از کان بدر آمد

با خاکِ درِ شاہ ز خویش مزن دم
از ذرہ سخن گوئی کہ خورشید گر آمد

با ذرۂ خاکِ درِ خسرو چکند مہر
خود روشنی مہر ازین خاک درآمد

مہر از شرفِ خویش بمن داد نشانی
وانگہ بہ نظرگاہ شہم راہبر آمد

آن وعدہ کہ فرداست ہم امروز وفا شد
کاینک رخِ رخشندۂ شہ در نظر آمد

این دیدِ گرانمایہ بہر دیدہ نبخشند
منت کشِ چشمم کہ حقیقت نگر آمد

با کوس و علم علم و ہنر چون نکند جمع
شاہی کہ بفرہنگِ خرد نامور آمد

با لعل و گہر جود و کرم چون ندہد ساز
شاہی کہ بہ فرتابِ نظر مہرفرآمد

در عہدِ وی آسیب جزین نیست کہ گویند
بر کشتیِ درویش ز موجے گہر آمد

از راہِ کرم پایۂ اہلِ ہنر افزود
از روی خرد کارروائی ہنر آمد

ہر جا کہ سپہ برد زمین موجۂ خون زد
ہر سو کہ رخ آورد نویدِ ظفر آمد

رازِ دلِ سودا زدہ در سینہ نہ گنجد
اندیشہ بآہنگِ غزل پردہ درآمد

بر نعشِ من از ناز و ادا مویہ گرآمد
تا روز فرد رفت شب ہجر سرآمد

ما را بستم کشت و فریبد دگران را
در حلقۂ ماتم ز رہِ لہو درآمد

تنکست رہِ عشق، بیا تا بہ نمایم
خون می چکد از بادکزان رہ گزر آمد

تا می چہ قدر جوش بہ خم زد کہ درین دور
ما را بہ نخستین قدح اندر کدر آمد

سازِ طربم تا چہ نوا داشتہ باشد
چون زخمہ و تارش ز رگ و نیشتر آمد

آوازہ شنیدیم و ندیدیم ہمانا
معشوقہ نوائیست کہ از پردہ برآمد

چون جز بہ گرایش نفرستند بلا را
چندانکہ بلا بیش، طرب بیشتر آمد

دیگر رہِ بیرونِ شدِ خوناب نبودست
در خستگیِ دل فرح از چشمِ تر آمد

خنجر بہ کفِ دشمن و نشتر بہ کفِ دوست
سودا زدۂ عشقِ ترا خون بدر آمد

یک شعلہ بود غم کہ ازان شعلہ بہ تقسیم
دود از دم و سوز از دل و داغ از جگر آمد

غالب بہ ادب باش کہ در بزمِ شہنشاہ
فرشیست کش از اطلسِ چرخ آستر آمد

این منظرِ اقبال بدان پایه بلندست

کز گردشِ سر شخص خرد را خطر آمد

در دانش و بینش ز شهنشه سخن آرم

کش دیده و دل مایه دهِ یکدگر آمد

دل آئینه و دیده بود جامِ جهان بین

ہنگامۂ اسکندر و جمشید سرآمد

نازم بسویدای دلش کاین ورقِ راز

مجموعۂ احکامِ قضا وقدر آمد

ہر کس کہ ز مشکین نفسیہای تو دم زد

چون سایہ سواد ختنش بر اثر آمد

در رہ گزرِ مدحِ تو چندانکہ زدم گام

چون سبزہ رہِ سطحِ فلک بی سپر آمد

با باد ز رخشِ تو سخن رفت و فروماند

با ابر ز ایثارِ تو گفتیم، تر آمد

زان روی کہ ماند برخش راہ غلط شد

گر زخم بداندیشِ ترا بر سپر آمد

بدخواہِ ترا کش خطر از عالمِ بالا ست

چون پرتوِ مہ سیل ز دیوار و در آمد

آنی کہ نیِ کلکِ تو چون خامۂ تقدیر

پرکار کشای رقمِ خیرو شر آمد

نی نی ہمہ خیری تو و خیرست کہ در رزم
اقبالِ تو اعدای ترا جان شکر آمد

شر نیست جز امرِ عدمی کز رہِ ہستی
خیرست دمِ خنجر اگر تیز تر آمد

زان رو کہ نہ از زمرۂ اربابِ ریائیم
در مدح و دعای تو سخن مختصر آمد

گر خود ہمہ یک روز بود ہستیِ کونین
خوش باش! کہ عہدِ تو ہم آنرا سحر آمد

در خاتمہ ورزم روشِ شرط و جزا نیز
کاین شیوہ در آئینِ دعا معتبر آمد

تا نامزدِ صبح شناسند دمیدن
تا در صفتِ روز سرایند برآمد

ہر روز بدان جلوہ برآئی کہ سرایند
''خورشید بہ بیت الشرفِ خویش درآمد''

☆☆☆

در مدحِ بہادر شاہ

دوش در عالمِ معنی کہ ز صورت بالاست
عقلِ فعّال سرا پردہ زد و بزم آراست

خواند از دیدہ وری دیدہ وران را بہ بساط
تا بہ بینند کہ اسرارِ نہانی پیداست

رازِ ہفت اختر و نُہ چرخ پژوہند اینجا
در دبستان نتوان گفت کہ پرسش غوغاست

بر لب راز پژوہان نہ سزد مہرِ سکوت
ساقیِ میکدۂ ہوش زبانِ گویاست

دانش اندوز نباید کہ شکوہد ز سوال
رازہا غنچۂ نشگفتہ و گفتار صباست

زر پراگندہ و گنجور ترازو در دست
ما کہ شاہیم ز ما رخصتِ ایثار و عطاست

چون بدانش نتوان گشت توانگر بیبا
لاجرم ہر کہ گدای درِ ما نیست، گداست

رہروانی کہ بہنجارِ شناسا بودند
ناگہ از خویش رمیدند کہ یا رب چہ صلاست

اندران حلقه بدین فتنه هزاهز رو داد
وندران زمره بدین زمزمه غوغا برخاست

که نداریم درین دائره آهنگِ سماع
حاصلِ ما زنی و چنگ همیں صوت و صداست

کیست تا جرعه کشِ بادهٔ تحقیق شود
الحذر الحذر اے قوم که می ہوش رباست

این فریبنده سخنهای شناسائیِ راز
نشناسیم که ما را سخن از برگ و نواست

چون کس از همنفسان زخمه بر آن تار نزد
منکه آزادیم انداز و رم از خویش اداست

رفتم آشفته و سرمست و پس از لابه و لاغ
گفتم اینک دل و دین، گفت خوشت باد کجاست

گفتم اسرارِ نهانی ز تو پُرسش دارم
گفت جز محرمِ ذات که بیچون و چراست

گفتمش چیست جهان، گفت سراپردهٔ راز
گفتمش چیست سخن، گفت جگر گوشهٔ ماست

گفتم از کثرت و وحدت سخنی گوی برمز
گفت موج و کف و گرداب همانا دریاست

گفتم آیا چه بود کشمکشِ ردّ و قبول
گفت آه از سر این رشته که در دستِ قضاست

گفتمش ذرّه به خورشید رسد، گفت محال

گفتمش کوششِ من در طلبش، گفت رواست

گفتم آن خسروِ خوبان بسخن گوش نهد

گفت گر گوش نهد زهرهٔ گفتار کراست

گفتم از بالشِ پرچاره ندارد سرِ من

گفت هر سر که چنینست سزای سرِ پاست

گفتم از اهلِ فنا گر خبری هست، بگوی

گفت این قافله بی گردِ ره و بانگِ دراست

گفتم از داغ چه خیزد که نهندم بر دل

گفت چون درد گرانپای شود، داغ دواست

گفتم افسوس که کمتر دهدم دادِ سپهر

گفت خاموش که در داد نگنجد کم و کاست

گفتم آن بیت که همواره سرائی از کیست

گفت غالب که هم از غالبِ آشفته نواست

گفتم از چیست که چون شمع گدازد نفسم

گفت ای جانِ پدر روشنیِ طبع بلاست

برهِ بیتِ شرف مهر چرا شد گفتم

گفت کاشانهٔ سرهنگِ شهِ هر دوسراست

بوظفر قبلهٔ آفاق که در مسلکِ شوق

هر که رو سوی تو دارد بجهان قبله نماست

همہ عالم عدم و ذاتِ تو برہانِ وجود

الفی بر سرِ 'لا' چون بفزایند 'الا' ست

مادرش کور کند ہر کہ بزاید احول

بسکہ در عہدِ تو فرجام دوبینی برخاست

سایہ خود ہمرہِ شخصست و توئی سایۂ حق

سجدہ گر پیشِ تو آریم نہ بیجا کہ بجاست

سایہ چون لازمِ شخصست دو تا یعنی چہ

نیست ہمتای تو موجود کہ ایزد یکتا ست

بسکہ از فیضِ تو بالید بہاران بر خویش

موجِ گل دامِ گرفتاریِ مرغانِ ہواست

نشنوم صوتِ مزامیر و ضرورست سماع

لا جرم خامہ بہ گلبانگِ غزل پردہ سرا ست

گرہمین جوشِ بہارست چہ حاجت بصباست

کہ خود از تنگیِ جا پیرہنِ غنچہ قباست

خاک را سبزہ ہر آینہ بگردون رو کش

تاک را خوشہ ہمانا بہ ثریا ماناست

رنگِ گل بسکہ فراہم شدہ در طبعِ نبات

رستنی گر ہمہ برگست و گر خار حناست

گل شمر، گر بہ گلستان ہمہ سنبل بینی

خون زگرمی چو زند جوش و بسوزد سوداست

سایۂ نخل فزونِ گشت سوادش در دہر
بسکہ در روز بیفزود ز شب ہر چہ بکاست

گر فضایلش شمری جملہ، پر از گل نگری
آں تفاوت کہ در اندیشہ ز گل تا بگیاست

دمِ نظارہ چو لبلاب بہ پیچد بہ شجر
بسکہ از فیضِ نمو تارِ نگہ بہرہ رباست

نسبتِ نامیہ با سبزہ و گل خاص نماند
خود سخن ختم نگردد اگر از نشوونما ست

صوفیان را شدہ قطعِ نظر از غیر محال
کہ نظر نیز رہینِ مددِ آب و ہوا ست

در سرِ ذرّۂ ہر خاک ہوای دگرست
ہان و ہان سبزۂ نوخیز مگر ظلِ ہماست

سخن از ظلِّ ہما رفت، دگر یاد آمد
مدحِ شاہنشہِ والا کہ سزاوارِ ثناست

آسمان پایہ شہا، چرخِ برین بار گہا
ای کہ روی تو ہر آئینہ نظر گاہِ خداست

جان فشاندن برہت زندۂ جاویدم کرد
در صفِ صوفیہ گویند بقا بعدِ فنا ست

بندۂ سادہ دلم، بندگی آئینِ منست
از تو پرسش نہ و از بندہ پرستش بسزاست

بر من از بختِ نکوہیدہ چہ سنجم چہ گزشت

بر من از چرخِ فرومایہ چگویم چہ جفاست

ہرچہ با شوق ملائم نفتد، مرگِ دلست

ہرچہ بر طبع گوارا نبود، جان فرسا ست

خانہ از سیل بیفتد، بود ار سیلِ بہار

آتش از آب بمیرد، خود اگر آبِ بقا ست

رنجِ این نشاء گرانپای نباشد چندین

بر من آن میرود امروز کہ گوئی فرداست

خون چکد خاصہ ازان دل کہ خراشی دارد

ورنہ در سینۂ دل ہر کہ بہ بینی درداست

بسکہ گم گشت ز تاریکی و تنگی گویم

مگر آن کلبہ کہ من داشتمی در صحرا ست

اینکہ بینی و نپرسی کہ چہ خواہی، سہلست

آہ! ازآن دم کہ نہ بینی و پرسی کہ کجاست

رشحہ بر من بچکان، بادۂ گلرنگ بنوش

جرعہ بر خاک فشاندن روشِ اہلِ صفاست

اثرِ تربیتِ تست کمالم بہ سخن

زار مپسند بدین سحربیانی کہ مرا ست

فیض ھست قبولِ سخن و شادیِ فتح

بہ قلم نازم اگر تکیۂ موسیٰ بہ عصاست

ہمچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دہر قلم مدعی و نکتہ گرا ست

ذوق مدحِ تو بر آن داشتہ باشد کامروز
رگِ اندیشہ زدم گر چہ قمر در جوزا ست

اینکہ خور در حمل و مہ بہ دو پیکر باشد
ہست تسدیس و ہمایوں نظرِ مہر فزاست

بادہ با نیّرِ اعظم زدہ کیوان بہ حمل
ہمنشینی بہ شہنشہ ز کشاورز خطا ست

زہرہ دیدم بہ حملِ تن زدم از خبثِ زحل
بہرِ شہ مطربہ آوردہ نہ دہقان تنہا ست

قاضیِ چرخ کہ در خوشہ بود واژون پوی
متحیر کہ چرا اوج دو بالش یکجاست

چون فرود آمدہ مرّیخ بہ منزلگہِ ماہ
کلبۂ پیک طرب گاہ سپہبد نہ روا ست

تا چہ افتادہ کہ در خانۂ قاضیست دبیر
پرسشِ واقعۂ ہست اگر پرسی راست

گشتہ در دلو و اسد روی برو جادہ نورد
ذنب و راس کہ از طالع و غارب پیداست

لوحش اللہ گہر افشانیِ نالِ قلمم
یا رب آبشخورِ این ابر کدامی دریا ست

تاچه در راه فشانده است که از کثرتِ شوق

میرود خامۂ من پیشِ ولی رو بقفاست

نیست در رہروی از سایہ و سرچشمہ گزیر

خامہ رہرو بود و سایہ و سرچشمہ دعاست

تا قضا نسخۂ اجمالیِ آثار قدر

تا قدر صورتِ تفصیلیِ احکام قضاست

مجملۂ مہبطِ انوارِ الٰہی باشی

کانچہ خواہند ازین جملہ مفصل پیداست

☆☆☆

مدح ولی عہد مرزا فتح الملک بہادر

بازم نفس از سینہ بہ ہنجار برآمد
شد زخمہ روان، زمزمہ از تار برآمد

گویند کہ در روزِ الست از رہِ مستی
حرفی ز لب کافر و دین دار برآمد

آن از نعم آوازۂ انکار درافگند
این راز بلی معنیِ اقرار برآمد

آن آب کہ از خاک ہمی سبزہ دماند
در طینتِ آہن ہمہ زنگار برآمد

در دستِ یکی آبلہ زد دانۂ تسبیح
بر دوشِ یکی رشتہ ز زنار برآمد

زانگونہ درآمیخت یکی با صنمِ خویش
کش نقشِ دو پیکر بہ نمودار برآمد

زان رنگ جگر خست یکی را ستمِ ہجر
کش لختِ دل از دیدۂ خونبار برآمد

شبرو کہ نہ مردست بدزدیدنِ کالا
از زاویہ پنہان بشبِ تار برآمد

شب گرد کہ مردانہ و فردست پیِ پاس
در کوچہ بگردید و ببازار برآمد

راند ندیکی را کہ چو لب تشنۂ می رفت
ہم تشنہ لب از خانۂ خمار بر آمد

خواندند بدان مہر کہ از کعبہ یکی را
آوازِ بیا از در و دیوار برآمد

آن روفت درِ میکدہ و خردۂ زریافت
این کوفت درِ صومعہ و مار برآمد

شوریدہ ادائی بدمِ تیشہ روان داد
آشفتہ نوائی بسرِ دار برآمد

آسودہ بفردوسِ برین آدم و ناگاہ
از دمدمۂ دیو تبہ کار برآمد

آن یک کہ برآمد چہ قدر نام برآورد
وین یک کہ برآورد چسان خوار برآمد

مرغانِ چمن عربدہ بنیاد نہادند
مہر از افقِ گنبدِ دوّار برآمد

گرد از رہ و افغان ز لب و دود ز آتش
گوہر ز شط و لعل ز کہسار برآمد

بی شائبۂ جنبشِ کلک و صدفِ رنگ
چندین صور از پردۂ پندار برآمد

این دائرہ کز دور نیاسود زمانی
بی واسطۂ گردشِ پرکار برآمد

ہر حسن کہ اندر پسِ این پردہ نہان بود
گوئی ہمہ از پردہ بیکبار برآمد

ہم حسن باندازۂ مستوریِ خود ماند
ہم کامِ دل و دیدہ ز دیدار برآمد

نشگفت کہ یوسف بمیان داشتہ باشد
دلوِ من ازین چاہ گرانبار برآمد

پر گفتم ازین راز ولی چون نگرستم
ناگفتہ و نایافتہ بسیار برآمد

درشب زدم این نغمہ، کنون چون دمِ صبحست
از روز بہ بینم کہ چہ مقدار برآمد

امروز کہ ہنگامۂ عیدِ رمضان ست
از سینہ تفِ روزہ بافطار برآمد

زاہد بہ نشاطی زدہ از حجرہ بدرگام
کز کنجِ قفس مرغِ گرفتار برآمد

در صبح ہوا سلسلہ جنبانِ ہوس شد
ہر کس بروان کردنِ ہر کار برآمد

رفتم کہ طرازم سخن از مدحِ ولی عہد
نامم ہمہ در دہر بہ گفتار برآمد

سلطانِ کرم پیشہ ابوالفتح کہ دستش
در بحر فرو رفت و گہربار برآمد

زیبد گلِ اقبالِ خداداد بفرقش
زانسان کہ توان گفت ز دستار برآمد

از طلعتِ تابندۂ این کوکبہ آرای
مہری دگر از مطلعِ انوار برآمد

آن کوکبہ آرا کہ بہ ہنگامِ ورودش
دارا پیِ دریوزہ گداوار برآمد

در گوشۂ ہر باغ کہ بزمِ طرب آراست
چون شمع در آن باغ گل از خار برآمد

ریزد چو لبش حرفِ گرانمایہ تو گوئی
گنج از درِ گنجینۂ اسرار برآمد

با لشکرِ اژدرشکنِ قاف شگافش
ہر سوختہ اختر کہ بہ پیکار برآمد

یا چہرہ شد و تیغِ دو دم بر سر و رو خورد
یا قلعہ نشیں گشت و بزنہار برآمد

اندازۂ اندازِ کرم بین کہ بسائل
بخشید دو گیتی و خریدار برآمد

تا رفتہ بہ گلزار چو زان سوی گزر کرد
ہر نخل سراسیمہ ز گلزار برآمد

با ثابت و سیّار گرو بست بتابش
هر نکته که در مدحِ جهاندار برآمد

چون نطق بدین پایه رسانید سخن را
گفتم مگر از سعیِ من این کار برآمد

غالبؔ بغضب گفت که دعویٰ نه پزیرم
گر خود ز قلم گوہرِ شہوار برآمد

رو، سازِ دعا کن که ثنا حدِ تو نبود
این بس که تمنائی دلِ زار برآمد

آہنگ دعا دارم اگر خود نسرودم
مستم ز نوای که نه از تار برآمد

من در گرہ کوشش و بہ زانکہ بسیچم
مقصودِ من از طالعِ بیدار برآمد

سلطانِ جہان آنچہ خود از حق بدعا خواست
آمین ز لبِ ثابت و سیّار برآمد

☆☆☆

قصیدہ ضریحیہ

بیا در کربلا تا آن ستمکش کاروان بینی
کہ در وی آدمِ آلِ عبا را ساربان بینی

نباشد کاروان را بعد، غارت، رخت و کالای
ز بارِ غم بود گر ناقہ را محمل گران بینی

نہ بینی ہیچ بر سر، خازنانِ گنجِ عصمت را
مگر در خار و بن ہا تار و پودِ طیلسان بینی

ہمانا سیلِ آتش بردہ بنگاہِ غریبان را
کہ ہر جا پارۂ از رخت و موجی از دخان بینی

بہ بینی چشمۂ از آب و چون جوئی کنارش را
ز خونِ تشنہ کامان چشمۂ دیگر روان بینی

ز تابِ مہرِ گیتی سوز خطِّ جادۂ رہ را
بسانِ ماہیِ افتادہ بر ساحل، تپان بینی

زمینی کش چو فرسائی قدم بر آسمان سائی
زمینی کش چو گردی پا بفرقِ فرقدان بینی

بہر گامی کہ سنجی حوریان را مویہ گر سنجی
بہر سوئی کہ بینی قدسیان را نوحہ خوان بینی

ببینی سرخوشِ خوابِ عدم عباسِ غازی را
نه مشکش در خمِ بازو نه تیرش در کمان بینی

علم بنگر بخاکِ رهگذار افتاده، گر خواهی
که بر روی زمین پیدا نشانِ کهکشان بینی

هجومِ خستگان و سوز و سازِ نوگرفتاران
نو آئین بزم طوی قاسمِ ناشادمان بینی

نه می بینی که چون جان داد از بیدادِ بدخواهان
علی اکبر که همچون بختِ بدخواهش جوان بینی

گرفتم کاین همه بینی، دلی داری و چشمی هم
بخون آغشته نازک پیکرِ اصغر چسان بینی

چه دندان در جگر افشرده باشی کاندران وادی
حسین ابنِ علی را در شمارِ کشتگان بینی

نیاری گر دران کوشی که پایش در رکاب آری
نه بینی گر خود آن خواهی که دستش ن بینی

تنی را، کش رگ، گل خار بودی، بر زمین یابی
سری را، کش ز افسر عار بودی، بر سنان بینی

نگه را زان دو ابرو روبرو در خون تپان دانی
هوا را زان دو گیسو سو بسو عنبر فشان بینی

سنان با نیزه پیوندد همی زین رو، عجب نبود
که نی را از گره پیوسته در بندِ فغان بینی

گر از آهن بود گو باش غم بگدازد آهن را
سنان را هم ز بیتابی چو مژگان خونچکان بینی

شهادت خود ضمانت نیست لیک از روی آگاهی
پیِ آمرزشِ خلق این شهادت را ضماں بینی

همین فرد است تا توقیعِ آمرزش روان گردد
مرنج از ناروائی گر درنگی در میان بینی

وگر تاب شکیبائی نداری، دیده در ره نه
که هم امروز از بخشائشِ فردا نشان بینی

بود تا تکیه گاهِ ناز، آمرزش پژوهان را
ضریحی سوی هند از خاکِ آن مشهد روان بینی

تعالی الله ضریحِ فرخِ فرخنده فرجامی
که فرتابِ فروغِ فرخی از وی عیان بینی

به هنگامی که حمالان نهند از دوش در راهش
دمی بنشین که گردش گردشِ هفت آسمان بینی

ضیای، زان زیارت گاه بر روی زمین بارد
که خاکِ لکهنو را مردمِ چشم جهان بینی

برانگیزد قیامت مردگان را این قیامت بین
که از فیضِ ورودش در تنِ هر ذرّه جان بینی

جز آن بیدست و پا کز خاک نتواند که برخیزد
باستقبالِ تازان، اهلِ شهر از هر کران بینی

نفس در سینه داغ از تابشِ تابنده خور دانی
محل بر خلق تنگ از موکب شہزادگان بینی
سواران ہمچو مہرِ آسمان زرّین سلب یانی
ہیونان چون ثریّا گوہرین برگستوان بینی
بره رفتن ہجومِ گوہر آگین طیلسانان بین
کہ بر روی زمین چرخِ ثوابت را روان بینی
ہجومِ خاکیاں دیدی، سپس گردیدہ بر بندی
سروشان را باندازِ ثنا شیوابیان بینی
بہ والا پایہ نام آور سروشاں در ثنا خوانی
سمی رحمۃ للعالمین را ہمزبان بینی
محیطِ داد و دین سید محمد کز فرہ مندی
مر او را در جہانِ آگہی صاحبقران بینی
نژادِ خسروِ الفقر فخری گوی را نازم
کز استغنا بدرویشی درش سلطان نشان بینی
ز ہر جزوِ ضریحِ اقدس و دست ہمایونش
کفِ رضوان و مفتاحِ در باغِ جنان بینی
چو یابی خواجہ را در رہ چہ نیکو راہبر یابی
چو بینی ہدیہ را بر کف چہ فرخ نورہان بینی
سفالی بینی از ریحانِ فردوسِ بریں کاینک
بباغ جم حشم واجد علیشاہش مکان بینی

مگر در خواب دادند آگہی سلطانِ عالم را
کہ سوی شاہ از پیشِ شہنشاہ ارمغان بینی

طریقِ پیشوایان وحی و الہامست و خاصا نرا
بود خوابی کہ تعبیرش بہ بیداری ہمان بینی

حجابی درمیانِ بندہ و حق نیست، پندارم
درانجا آشکارست آنچہ اینجا در نہان بینی

روانی تشنۂ گفتارِ من دارد، شنیدن را
قلم را بعد ازین در مدحِ خاقان تر زبان بینی

نہفتہ دانیِ شاہ آشکارا شد، روا باشد
دلش را گر بدین آہنگ بر من مہربان بینی

نشاط اندوزیِ سلطانِ دانا دل، عجب نبود
ز رقصی کاندرینجا خامہ ام را در بنان بینی

رسد پیش از رسیدن نظمِ غالبؔ درنظر گاہش
لبش را در سخن ہمچون کفش گوہر فشان بینی

نہ بیند عرض لشکر ورنہ صف در صف سپاہش را
ز میدانِ اودا تا بیشۂ مازندران بینی

بیابان را نہ لشکر بلکہ طوفان در رہ انگاری
دلیران را نہ توسن بلکہ صرصر زیرِ ران بینی

بدان قانع نخواہی بود ار گنجینۂ سلطان
کہ در وی گنج باد آورد و گنجِ شایگان بینی

چه پرسش داری از خازن که خود بر طاق نسیانش
دو صد جا حاصلِ صد سالهٔ دریا و کان بینی

جهاندارا بکاخی کانِ طلسمِ فیض جا دارد
نشانِ سجدهٔ من نیز هم بر آستان بینی

در آن قدسی زیارت گاه بامِ کعبه را ماند
ز چشمِ دجله ریزِ من درانجا ناودان بینی

چه گویم چون همی دانم که میدانی و پسندی
که سعیم در سرانجامِ ستایش رایگان بینی

کمالش را طرازِ نازشِ عین الیقین بخشی
سخنور را گر از خود التفاتی در گمان بینی

خدایا تا بهاری و خزانی هست گیتی را
بهارِ دولتِ خود را به گیتی بے خزان بینی

ز بخششهای یزدان آنچه باید یافت، آن یابی
ز تابشهای اختر آنچه شاید دید، آن بینی

جهانسوزیست آئین مهر را در کشور آرائی
تو ماهِ چارده باشی و دشمن را کتان بینی

گر از روی غضب تاچخ بسوی دشمن اندازی
سنان را همچو منقارِ هما بر استخوان بینی

چرا گویم که تا در روز یابی مهرِ تابان را
چرا گویم که تا در تیره شب ز انجم نشان بینی

سخن کوتہ ز صبح و شام و مہر و مہ چہ اندیشم

تو باشی جاودان و دیدنیہا جاودان بینی

وگر خواہی کہ بینی چشمۂ حیوان بتاریکی

سوادِ نظم و نثرِ غالبؔ معجز بیان بینی

☆☆☆

در مدحِ بہادر شاہ بروز عید الفطر

عیدست و نشاط و طرب و زمزمہ عامست
می نوش، گنہ برمن اگر بادہ حرامست

باد از جہتِ بزمِ شہ آید مگر امروز
کز بوی گل و بادہ، فرح بخشِ مشامست

بر وعدۂ فردا چہ نہم دل کہ ز دیروز
در حلقۂ میم و شکنِ طرّۂ لامست

طوبیٰ ہمہ نخلیست کہ از جای نہ جنبد
اینجا سخن از ساقیِ طاؤس خرامست

پیداست کہ ساقی کہ بود دیرِ مغان را
ہر چند من از رشک نگویم کہ چہ نامست

زلفش نگر، آنگہ بمنِ شیفتہ بنمای
گر سنبلِ فردوس چنین غالیہ فامست

دی نوبتیِ شاہ گہِ شام دہل کوفت
کامشب بجہان خاتمۂ ماہِ صیامست

گوئی رمضان رفت بہ شبگیر و درین راہ
منزلگہِ دیروز ہمان سرحدِ شامست

از فرخیِ عید و تماشای مہِ عید
در نغمہ سرائیست اگر خود لبِ بامست

گر خلق بانگشت نمایند مہِ نو
مارا بکف از ساغرِ می ماہِ تمامست

ہر شب غمِ آن بود کہ چون صبح زند دم
بر خاک بریزیم اگر آب بجامست

امشب چہ غم از صبح کہ در انجمنِ ما
افطار بہ گلبانگِ می آشامیِ شامست

عیدست و صلای خور و نوش ست جہان را
می روزہ نباشد کہ درین روز حرامست

از روزہ اگر کوفتۂ، بادہ دوا گیر
این مسئلہ حل گشت ز ساقی کہ امامست

می نوش و میندیش و مکن شرم کہ در شہر
میخوارہ بود حاکم و واعظ ز عوامست

گر واعظِ دل مردہ سفیدست ردایش
خود لوحِ مزاریست کہ از سنگِ رخامست

لب تشنگیِ بادۂ گلرنگ ندانست
آن خواجہ کہ امروز در ایثارِ طعامست

خود وجہِ می از قیمتِ حلوا نبود بیش
آلاتِ سفالینہ بہایش دو سہ دامست

آہنگِ تو در زمزمہ دل می برد از کف

ہین مطربِ مرغولہ نوا اینچہ مقامست

ہاں ہمدمِ دیرینہ کہ غمخوارِ منستی

رو، بادہ بچنگ آر اگر خود ہمہ وامست

وام ار نتوان، خرقہ و سجادہ گرو کن

لیکن ز مئِ پختہ بہ آن بادہ کہ خامست

آن بادہ کہ از رائحہ قوتِ دل و جان ست

آن بادہ کہ از ذائقہ سودِ لب و کامست

در دائرۂ دورِ قدح دیر نگنجد

ساقی گری، آوردنِ جام از پئِ جامست

چون بیخودیم روی دہد یک قدح از می

در جیب خرد ریز کہ این حق مسامست

امیّد کہ چون بندہ تنکمایہ نباشی

می خوردنِ ہر روزہ ز عاداتِ کرامست

ہشدار کہ در مستی اگر پای نہ لغزد

زین زاویہ تا میکدہ میدان دو سہ گامست

گیرم کہ نشاط آمدہ چون مرغ بہ پرواز

آخر نہ تو صیّاد و قدح حلقۂ دامست

گویند کہ گردون دگر آرد رمضان را

تا یازدہ مہ خود سخن از شرب مدامست

آری ز عطای شہِ جم کوکبہ مارا
نعمت بکمالست و تنعّم بہ دوامست

سلطانِ فلک رخش، بہادر شہِ غازی
کش ابلقِ ایام درین دائرہ رامست

گردندہ فلک بنگر و خورشیدِ درخشاں
شہ رائضِ این توسنِ زرّینہ ستامست

عیدست و دمِ صبح و بود انجمن آرای
شاہی کہ درش قبلۂ جمہورِ انامست

عامست زمین بوسِ شہنشاہ درین روز
از بندہ سوے قیصر و فغفور پیامست

والا خلفِ شاہجہان بین و شکوہش
از شوکتِ محمود چگوی کہ غلامست

ای شاہِ سخنور کہ بہ احیای معانی
کار سخن از معجزِ نطقِ تو بکامست

ایمان بہ دلآویزیِ گفتارِ تو داریم
ماراچہ اگر نظم نظامی بنظامست

با منظرِ اقبالِ تو اوچیست کہ آن را
از سبزۂ گردون خطِ پشتِ لبِ بامست

تا فرق توان کرد خدا را ز خداوند
در پیشِ شہ از ما عوضِ سجدہ سلامست

با ساغرِ شه ساغرِ خورشید سفالست

با خنجرِ شه خنجرِ مرّیخ نیامست

در ،بزم ندیمِ تو اگر تور و پشنگ ست

در رزم، زبونِ تو اگر رستم و سامست

بدخواهِ تو در بد روشی عاد معادست

سرہنگِ تو در تیغ زنی سام حسامست

دریوزۂ سیم و زر و لعل و گہرم نیست

گفتارِ مرا جایزہ تحسینِ کلامست

غالبؔ چہ زندم ز دعا کز تو خود او را

توقیعِ ثنا خوانی و اقبال مدامست

دور ست ہمی چشمِ بد از روی تو وانگاہ

این نامہ کہ زد خامہ رقم زخم نیامست

☆☆☆

درمدحِ بہادرشاہ بروزعیدِ قربان

دمی کہ گشت نوامندیِ تماشا را
سپیدۂ سحریٰ غازہ روی دنیا را

بدلکشائیِ رفتارِ زخمہ، مطربِ بزم
کشود راہِ برون شد ز ساز آوا، را

فروختیم متاعِ سخن، بدین فریاد
کہ مژدہ باد شناسندگانِ کالا را

ز اجرِ بندگیِ بت گزشتم، آن خواہم
کہ نشوم ز رقیبان دیرِ غوغا را

چرا بود کہ سکندر رود بتاریکی
فشردہ ام بخرابات لای پالا را

قرارداد چنیں بودہ است پندارم
کہ روزِ خوش نہ نمایند چشمِ بینا را

عیار کعبہ روان تا بہ تشنگی گیرند
ندادہ اند دران دشت راہ دریا را

در آبہ کلبۂ ویرانِ ما کہ پنداری
ز شش جہت بہم آوردہ ایم صحرا را

ز سرنوشت جدا نیست نامۂ اعمال
طرازِ صورتِ دی بوده است فردا را

بعہدِ خویش سگالم ہلاک ہفت سپہر
بمن دہند مگر کاروبارِ آبا را

بہ دزدی آمدہ ہندوی غم بکعبۂ دل
کہ برکند حجر الاسودِ سویدا را

ہزار دوزخِ سوزندہ در قفا ماند است
ہمی برد بہ ستم تا کجا برد ما را

ز رازِ اختر و گردون چہ دم زنی کہ ہنوز
ہمی ز ہم نشناسی ستان و دروا را

برو مصوری آموز تا چو کار کنی
دران میان نگری روی کارفرما را

ز دست رفتہ عنانم بعالمی کہ دران
بہ رشتہ ریش کند طفل، پای عنقا را

خمی ز بادہ مرا بود از عزیزان پرس
کہ ریختند پس از من بخاک صہبا را

نہ خون چکیدہ ز ریش و نہ بودہ دیدہ ز پیش
ز چاکِ سینہ چہ ارزش فزود خرما را

تو ای کہ چون بہ عدو طرحِ آشتی فگنی
بہ من در افتی و پرسی طریقِ حلوا را

بحقِ تلخیِ زہرابِ غم کہ نوشم باز
ز بوسہ بر لبِ من ریز منّ و سلویٰ را

بہای دل نشماری فزون ز نیم نگاہ
مگر فروختہ باشم متاعِ یغما را

دمیکہ ولولۂ رستخیز انگیزد
ز خوابگاہِ لحد طفل و پیر و برنا را

روان درائی و در عذر آن ادای خرام
بحل کنند ستمہای بی محابا را

فزاید آن ہمہ جرأت بہ وانمودہ نظیر
کہ اہلِ حشر شفاعت کنند لیلیٰ را

و گر بہ جایزہ آن طرّۂ خم اندر خم
نہند در کفِ شوقم نہ زلفِ حورا را

بساطِ عیش ز جنت برم بپایۂ عرش
بہ بیخودی نشناسم ز سدرہ طوبیٰ را

تو مہر پیشہ ولی بند غم نہ آغوشت
چراست کایں ہمہ درہم فسردۂ ما را

وگر زبانہ دمی نامد از عدم بوجود
چہ روی داد روانہای نا شکیبا را

بجلوہ گاہِ شہود آمدم چرا تنہا
مگر نیافتہ باشم بغیب ہمتا را

دگر بود ز چه ناید نہ اندرین محفل
شکستہ ایمٔ بروی بساط مینا را

نگفتہ ام کہ مکن قبلہٴ دعا از نور
ولی چہ سود پراگندہ کردن اجزا را

مشو ستارہ پرستار، کافتابی ہست
فروگرفتہ فروغش نہان و پیدا را

بدان کہ از رہِ صورت نہ از رہِ معنیست
ز ہم جداست اگر قبلہ گبر و ترسا را

مراست قبلہٴ حاجات و کعبہٴ اعمال
یگانہٴ کہ بیزمش کشودہ ام جا را

روم، بگردِ سرش گردم ار چہ بی ادبیست
بہانہ ساختہ ام رسمِ عیدِ اضحیٰ را

مگو کہ گردِ سرِ بادشاہ گردیدن
نہ درخورست جز آن چترِ آسمان سا را

بہ کعبہ رشک برم زان کہ در دلم گزرد
کہ کعبہ داشتہ باشد خود این تمنا را

ز من بپرس ہر آئینہ کان جہانبان کیست
مباد نام بری کیقباد و دارا را

فروغِ اخترِ دنیا و دین بہادر شاہ
کہ اختران بدرش سودہ اند سیما را

جهانِ دانش و بینش که در جهانداری
فزوده فرّه و فرهنگ لفظ و معنیٰ را

ز دیر باز تماشائیانِ خیره نگاه
گزیده اند غلط های راست مانا را

قضا دریچهٔ مینو کشوده در نی بست
هوای کاخِ مصور بود زلیخا را

رخِ مخدّرهٔ دین ندیده در مستی
کشیده اند در آغوش زالِ دنیا را

طرازِ کسوتِ نام آوری شناخته اند
لوای و مسند و تاج و نگین و تمغا را

خدایگانِ سلاطین به شیوهٔ تحقیق
گست بندِ روشهای ناشناسا را

برغمِ تختِ سلیمان که بر ہوا می رفت
بروی آب ہمی گسترد مصلاّ را

به عکسِ خاتمِ جم کاہرمن ربود از وی
ہمی نہد به نگین خانه چشمِ بینا را

بہای خاکِ درش میدہند آبِ حیات
بران سریم که برہم زنیم سودا را

ز نظمِ شاه چگوئی مگر فرود آری
پیِ مثال ز اوجِ فلک ثریا را

ز شاہ معجزہ آندم طلب کہ در جنبش
بہ گاہوارہ سخن گو کند مسیحا را

نہ در بہار کہ گر در خزان سحرگاہی
بفرض سوی گلستان رود تماشا را

بہ یمنِ مقدمِ خاقان بہ صحنِ باغِ نبات
برد ز نامیہ از بسکہ قسط اوفیٰ را

خورد بچرخ سرش ناگہان اگر فرّاش
فراز سبزہ نہد تکیہ گاہ دیبا را

دمِ افادہ ز حکمت چنان سخن راند
کہ بنگرند ز صورت جدا ہیولیٰ را

نہ از مشاہدہ مانا کہ از شنیدنِ اسم
نشان دہد کہ چہ در دل بود مسمیٰ را

زہی ز روی شناساوری شناساگر
رموزِ تفرقہ و جمع و 'لا' و 'الّا' را

چو بحر و موجہ و گرداب در نظر دارد
شہودِ ذات و صفات و شیون و اسما را

روا بود کہ در اندیشہ انحصار کند
تجلیاتِ کمالاتِ حق تعالیٰ را

شدم خموش دگر لب چہ میگزی غالبؔ
من آن نیم کہ نہ فہمیدہ باشم ایما را

گریز گاه جز این جادہ رہگوار نداشت
گزر بہ منطقِ صوفی فتاد انشا را

نشاط ورزم از انجامشِ ثنا بدعا
بدین پیالہ کشم بادۂ تولّا را

وجود تا نبود جز بہ چشم، بینش را
نمود تا نبود جز بہ لفظ، معنیٰ را

بہر صورتِ پیوندِ لفظ و معنی باد
طرازِ نامِ شہنشاہ و طرزِ طغرا را

ز روی ضابطۂ مدت آن بود یک روز
سنینِ عمرِ شہنشاہِ عالم آرا را

کہ سعیِ سیرِ ثوابت بحسبِ رای حکیم
در آورد بہ نشانگاہِ ثور، جوزا را

☆☆☆

در مدحِ بہادر شاہ ظفر

دیگر بدان ادا کہ وزد در بہار باد
دارد بہ پویہ کلکِ مرا بیقرار باد

وقتست کز تراوشِ شبنم ز جوشِ مہر
گوہر فشان شود بسرِ سبزہ زار باد

وقتست کز شگرفیِ آثارِ نامیہ
بندد حنا ز لالہ بدستِ چنار باد

وقتست کاورد ز رہ آورد نوبہار
بے جام و آبگینہ می بے خمار باد

با محتسب بگوی کہ مستی گناہ نیست
زین پس بجای بادہ خورد بادہ خوار باد

گنجِ روانِ باد، کند ناپدید خاک
رازِ نہانِ خاک، کند آشکار باد

بود از گہر بہ بطنِ صدف نقشبند ابر
گشت از شفق بر اوجِ ہوا لالہ کار باد

از تنگ ورزیِ گل و نسرین کہ باہمست
در رہروی خورد بخیابان فشار باد

سوسن کشیده خنجر و سنبل نهاده دام

بشگفت کز میانه رود بر کنار باد

گل بین که خست در گزرِ باد و همچنان

خندد بعشوه تا نشود شرمسار باد

رفت آنکه پوی پوی بهرسو ز خاکِ راه

انگیختی غبار به نیروی کار باد

بنی که سبزه زار همی بر هوا رود

انگیزد از بسیطِ زمین گر غبار باد

از گونه گون شقائق و از رنگ رنگ گل

زد نقشهای بو قلمون صد هزار باد

سنبل چرا ز غصه نه پیچد به خویشتن

کش جز به سبزگی نه نهد در شمار باد

در باغ و راغ بهرِ نمودِ شکوهِ خویش

دارد هوای پرورشِ برگ و بار باد

فرجام شادیِ خود از انبوهیِ نهال

بیند دمی که بگورد از شاخسار باد

صبر از نهادِ خاک بدر برد نوبهار

تا رشک بر زمین نبرد زینهار باد

زین بعد رنگ را نتواند نهفت خاک

زانسان که بوی را نبود رازدار باد

بنگر قماشِ سبزه که بافد ردای خضر

بی آنکه پود را بهم آرد بتار باد

با آب در سپارشِ گل شد سخن دراز

هر لحه هرزه نگزرد از جویبار باد

با عطرِ پیرہن نگراید ز بوی گل

عشاق را نمانده دگر غمگسار باد

یا سرو سنج سنجد و گل، پیرہن درد

رقص از تدرو جست و سرود از ہزار باد

نی باد بلکه خودِ دم جان بخشِ عیسویست

نامش نهاده اند درین روزگار باد

زان رو که چار سوی جهان را فرو گرفت

مانند پرچمِ علمِ شهریار باد

سلطان ابوظفر که ز بیمِ سیاستش

خم خورده از چراغ سرِ ره گزار باد

خورشید، فردِ دفترِ آثار رای اوست

اینک ربوده این ورقِ زرنگار باد

در بزم گه، نهاده بفرقش نسیم گل

در رزم جا، فتاده ز تیغش فگار باد

بادست زخشِ شه که دہد خاک مالِ خصم

آسان ز قومِ عاد برآرد دمار باد

با بادپای شاه گر از روی داوری

در ره نهد نشان و درآید بکار باد

تازد بدان شتاب که در بازگشتِ وی

گردد همان بگامِ نخستین دوچار باد

نازم بدان همای همایوں اثر که هست

در کارزار آتش و در خارزار باد

در ره گزارِ فوج نگر گرد باد را

کز بیمِ ترکتاز خزد در حصار باد

افتاده گر به طرهٔ گردِ رہش گره

گردید شانه وش همه تن خار خار باد

صبحی بفرخ انجمنِ شهریار یافت

از بهر کارسازیِ نوروز بار باد

افشاند لاله و گل و ریحان در انجمن

کز دیر باز بود درین انتظار باد

پیغاره چیست گر نه بآئین فشانده شد

کاورده عذر خواه کفِ رعشه دار باد

در عرضِ رنگ و بوی ریاحین بهار را

باشد به پیشگاهِ چمن پیشکار باد

در مدحِ شه روانیِ طبعم به بادِ صبح

ماند بشرطِ آنکه بود مشکبار باد

در بزم گاهِ نظم ز دودِ چراغِ من
یابد شمیمِ نافۂ مشکِ تتار باد

از جنبشِ قلم بہ کمین گاہِ فکرِ من
باشد فرشتہ صید ، سلیمان شکار باد

از بختِ تیرہ طبعِ روانِ مرا چہ بیم
خوش بگورد ز خلوتِ شبہای تار باد

بیرون ز مقتضای طبیعت کرشمہ ایست
دانی کہ از چہ می وزدم بر مزار باد

خواہد کہ بہرِ سرمۂ چشمِ سخنوران
خاکِ مرا برد بہ صفاہان دیار باد

راند سخن گر از نفسِ گرمِ من بباغ
در رخصتِ خوابِ غنچہ فشاند شرار باد

با من حدیثِ ہمنفسانِ ترہات گیر
وز رفتگان اگر رود آنرا شمار باد

خود را طفیلِ شاہ ستایم کہ بہرِ گل
بندد طرازِ نامیہ بر جیبِ خار باد

گفتی کہ حقِ مدح ز غالبؔ ادا نشد
در موقفِ دعا نفسم حق گزار باد

دولت بکارگاہِ بقا زد دم از دوام
یا رب بقای خسروِ فرخ تبار باد